سید راشد

○

سعید راشد

○

سلمان
SALMAN SALEEM
PRESENTS

بُک ٹاک پبلشرز، بُک سیلرز، امپورٹرز

میاں چیمبرز، ۳۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور، فون:۔ ۳۰۳۳۲۱

حیاتِ قائدِ اعظمؒ

اہتمام ــــــــــــــــ رانا سلطان محمود
تزئین ــــــــــــــــ خضر سلطان
اشاعت ــــــــــــــــ ۱۹۸۹ء
مطبع ــــــــــــــــ معراج پریس لاہور
قیمت ــــــــــــــــ اسّی روپے (۸۰/=)

فہرست

پیش لفظ

مطلوبُ الحسن سیّد نے جو قائدِ اعظم کے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک پرائیویٹ سیکرٹری تھے، قائدِ اعظم سے ایک فوجی افسر کی مُلاقات کا ایک دلچسپ اور فکر انگیز واقعہ بیان کیا ہے۔

ایک ممتاز مُسلم لیگی لیڈر بمبئی میں رہتے تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی برطانوی فوج میں افسر تھے اور برما میں تعیّنات تھے۔ وُہ چُھٹّی پر کچُھ دنوں کے لِیے بمبئی آئے ہُوئے تھے۔ ایک رات دونوں بھائی رات کے کھانے پر قائدِ اعظم کے ہاں آئے بات چیت کے دوران نوجوان فوجی افسر نے قائدِ اعظم سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان اِقتصادی طور پر قابلِ عمل نہیں ہوگا۔ قائدِ اعظم نے اُن سے پُوچھا کہ تم بتاؤ تمہاری اِس بارے میں کیا رائے ہے؟ نوجوان فوجی افسر نے فوراً کہا کہ ہمارے نزدیک تو پاکستان یقیناً اِقتصادی طور پر قابلِ عمل ہوگا۔ قائدِ اعظم نے پُوچھا "کیا تم یہ محض خوش کرنے کے لِیے کہہ رہے ہو؟" فوجی افسر نے کہا "ہم تو فوجی افسر ہیں ہمارا کام تو صرف حُکم ماننا ہے سوچنا نہیں۔"

اِس پر قائدِ اعظم نے فرمایا:

"اگر کبھی میری آرمی ہُوئی اور اُس پر میرا کنٹرول ہُوا تو مَیں سب سے پہلے تمہیں فوج سے نکال دُوں گا۔ کیونکہ میری آرمی میں بے دماغ لوگوں کے لِیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔"

قائدِ اعظم کا قول پاکستان کی مسلّح افواج کے لِیے رہنما اصول کی حیثیّت رکھتا ہے

آزادی سے پہلے تاجِ برطانیہ کے وفادار سپاہیوں اور افسروں کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ صرف دلیر ہوں، وہ صرف حکم مانیں اور دماغ سے نہ سوچیں۔ جنگ کی نوعیت بھی ایسی تھی کہ سوچنا لازمی نہیں تھا۔ آزادی کے بعد آزاد نظریاتی مملکت کی مسلح افواج کے لیے بہادر ہونا، دلیر ہونا، وفادار ہونا بھی ضروری ہے اور روشن دماغ اور روشن ضمیر ہونا بھی، کیونکہ وُہ اِس مملکتِ خُداداد کی جُغرافیائی سرحدوں کے ہی مُحافظ ہیں اور نظریاتی سرحدوں کے بھی۔ اُنہیں زمین کے ایک ٹکڑے کی حفاظت ہی نہیں کرنی بلکہ زمین کا یہ پاک ٹکڑا جن تصوّرات اور عقائد کی حفاظت اور نشو و نما کے لیے بنا ہے اُن کی حفاظت کرنا بھی افواجِ پاکستان کا مقدّس فرض ہے۔

سعید راشد

سوانحی خاکہ

کسی بڑے آدمی کی بڑائی کا تعلق اس کے بڑے کردار اور بڑے کارناموں سے ہوتا ہے۔ پیدائش کی جگہ، نسل، خاندان یا زبان سے نہیں۔ پھر بھی جو عقیدت، محبت اور ارادت ہمیں قائداعظم محمد علی جناح کی ذات اور صفات سے ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم یہ بھی معلوم کریں کہ یہ مٹی کہاں کی تھی؟ یہ کوہ نور کہاں سے آیا تھا؟ یہ حاصل چمن کس شاخ پہ کھلا تھا؟

خاندانی پس منظر

محمد علی جناح کے دادا پونجا بھائی میگھ جی گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک رجواڑے گونڈل کے گاؤں پانیلی کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار پانیلی کے کھاتے پیتے عزت دار گھرانوں میں ہوتا تھا۔ یہیں ان کا کھڈیوں پر کپڑا بننے کا اچھا کاروبار تھا۔ پونجا بھائی میگھ جی کے تین بیٹے تھے۔ والجی، ناتھو اور جینا۔ یہ تیسرے اور سب سے چھوٹے جینا بھائی پونجا جو ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ تیز اور ہوشیار تھے۔ ان کا ذہن تجرباتی تھا اور وہ

آگے بڑھنے کا غیر معمولی عزم و حوصلہ رکھتے تھے۔ پانیلی کی تنگ دنیا سے نکل کر انہوں نے ریاست کے سب سے بڑے قصبے گونڈل میں تجارت میں قسمت آزمائی کی۔ گونڈل میں ان کی تجارت خوب چمکی لیکن ان کی ہمت، محنت اور حوصلے کی جولانی کے لیے کسی وسیع تر میدان کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ گونڈل کو خیرباد کہہ کے کراچی آکر آباد ہو گئے۔ جینا پونجا نے کھارادر کی نیو نہم روڈ پر پتھر اور چونے کی بنی ہوئی ایک بلڈنگ کے دو کمرے کرائے پر لئے اور کاروبار شروع کیا۔

ایک اور روایت کے مطابق پونجا میگھ جی ہی کاٹھیاواڑ سے اپنے تین بیٹوں والجی، ناتھو، جینا اور بیٹی مان جی کو لے کر کراچی آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اور تجارت کرتے تھے۔ میگھ جی نے اپنے بڑے بیٹے والجی پونجا بھائی کے نام سے ایک تجارتی فرم بھی قائم کر لی تھی۔ جو مچھلی، گوند اور چمڑا دساور کو بھیجنے کا کاروبار کرتی تھی۔ کچھ بھی ہو اتنا تو ثابت ہے کہ جینا پونجا بھائی، والجی اینڈ کمپنی کے کاروبار میں شریک تھے۔ چمڑے اور مچھلی کی تجارت اور بینکاری میں انہوں نے بڑا پیسہ کمایا تھا اور نام پیدا کر لیا تھا۔

جدید تحقیق سے جینا پونجا بھائی کے بارے میں جو دلچسپ اور فکر انگیز انکشافات ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کراچی کے اولین تعلیمی ادارے، چرچ مشن اسکول، میں استاد بھی رہے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسی سکول میں یا کہیں اور انہوں نے خود بھی تعلیم حاصل

کی ہو گی۔ بہرحال انگریزی وہ ضرور جانتے تھے۔ ایسے کاغذات دریافت ہوتے ہیں جن میں انگریزی میں ان کے دستخط جناح پونجاہ ثبت ہیں.

جینا پونجا بھائی جینا، سے جناح کیسے بنے؟ اس کی بھی اپنی کہانی ہے پونجا میگھ جی آغا خان اوّل کے معتقد تھے۔ جو ایران سے بلوچستان کے راستے آکر سندھ کراچی میں آباد ہو گئے تھے۔ ایران کے اس امیر کبیر اور عالم خاندان کے متوسل امراء سے پونجا میگھ جی کے خاندان کے قریبی تعلقات تھے۔ اس حد تک کہ جینا پونجا بھائی کی شادی ۱۸۷۴ء میں آغا خاں اوّل کے ایک وزیر موسیٰ جمعہ کی بیٹی شیریں بی سے ہو گئی۔ جو اپنے حسنِ صورت و سیرت کی وجہ سے اپنی گجراتی سسرال میں مٹھی بائی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اس عالی نسب، ایرانی خاندان میں رشتہ ملنے سے جینا پونجا کے گھرانے پر بڑے دور رس اثرات مرتب ہوتے غالباً اسی خاندان سے تعلق کا نتیجہ تھا کہ جینا پونجا نے لفظ جینا کو (جینا یا جیڑان گجراتی میں دُبلے پتلے کو کہتے ہیں) عربی کے جناح سے بدل دیا اور پونجا کو پونجاہ لکھنا شروع کیا۔ جینا سے جناح بننا صرف لفظوں کا فرق نہ تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ کاٹھیاواڑ کے اس قدیم خاندان پر جس کا آبائی پیشہ تجارت تھا اب علم و فضل، سیاست اور فراست کے دروازے بھی کھل گئے۔

پیدائش

جناح پونجا کے ہاں نیو ہنم روڈ پر، چھاگلہ اسٹریٹ والے کرائے کے مکان

(وزیر مینشن) میں پیر کے دن دسمبر کی ۲۵ تاریخ ۱۸۷۶ء کو پہلا بیٹا پیدا ہوا - اس کا نام خاندانی روایت کے مطابق بچہ کے ایرانی ماموں قاسم موسیٰ نے محمد علی رکھا - جناح پونجا کے گھرانے میں یہ پہلا خالص اسلامی نام تھا - ورنہ اس سے پہلے ان کے ہاں نام گجراتی میں رکھے جاتے تھے - عقیقہ پہ بچہ کے نام، محمد علی، کے ساتھ جناح بھائی کا اضافہ کیا گیا عقیقہ کے لیے ایک روایت کے مطابق ننھے محمد علی کو خاندان کے آبائی گاؤں پانیلی لے جایا گیا - جہاں ایک صوفی خوجے بزرگ حسن پیر کی درگاہ پر روایتی اہتمام سے اس کے عقیقے کی رسم ادا کی گئی - بچہ کا نام محمد علی رکھنے اور عقیقے کے لیے اسے صوفی بزرگ کی درگاہ پر لے جانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناح پونجا کے گھر کا ماحول شائستہ اور فضا مذہبی تھی -

بہن بھائی

محمد علی اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے - ان سے چھوٹی ایک بہن تھیں - رحمت جو ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئی تھیں - پھر بھائی بندے علی، بندے علی کے بعد ایک اور بہن، مریم بی - مریم کی پیٹھ پر احمد علی ہوئے - پھر شیریں، شیریں کے بعد فاطمہ، جو ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئیں اور بعد کو فاطمہ جناح کے نام سے مشہور ہوئیں سب سے چھوٹا بھائی بچو، عقیقے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا -

ابتدائی تعلیم

محمد علی کی بسم اللہ چھ سال کی عمر میں ہوئی۔ قرآن شریف اور گجراتی پڑھانے کے لیے گھر پر ہی ایک استاد کا انتظام کیا گیا۔ ۱۸۸۲ء میں پرائمری کی تعلیم کے لیے گوکل داس میتج پال اسکول بمبئی میں داخل ہوتے۔ ۴۔ جولائی ۱۸۸۷ء کو انہیں سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی کے انگریزی کے پہلے درجہ میں داخل کرایا گیا۔ اس سے پہلے وہ گجراتی کے چوتھے درجے تک تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ سندھ مدرسۃ الاسلام سرسید کی تعلیمی تحریک کے زیر اثر ۱۸۸۵ء میں قائم ہوا تھا اور اس کو قائم کرنے میں جناح پونجا نے جو کبھی خود بھی استاد رہے تھے علمی دلچسپی لی تھی۔ گویا اپنے روشن دماغ باپ کے واسطے سے محمد علی جناح سرسید کی علمی، فکری اور اصلاحی تحریک سے سیراب ہوتے تھے۔ سندھ مدرسہ میں داخلہ لینے کے چند مہینے بعد وہ دوبارہ بمبئی چلے گئے۔ وہاں تھوڑے دنوں انجمن اسلام ہائی سکول میں میں پڑھا۔ اسے چھوڑ کر پھر واپس آئے۔ ۲۳۔ دسمبر ۱۸۸۷ء کو دوبارہ سندھ مدرسہ میں نام لکھا لیا۔ یہاں سے انہوں نے انگریزی کا چوتھا درجہ پاس کیا۔ ۳۰۔ جنوری ۱۸۹۲ء کو جب وہ انگریزی کے پانچویں درجہ میں تھے تو انہوں نے آخری بار سندھ مدرسہ کو شادی کرنے کے بعد خیر باد کہا۔ شادی کے بعد انہوں نے کراچی کے سب سے پرانے

انگریزی اسکول، چرچ مشن اسکول میں ۸ رمئی ۱۸۹۲ء کو داخلہ لیا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اُنہوں نے چرچ مشن اسکول چھوڑا۔ اس وقت وہ انگریزی کے چھٹے درجے میں تھے۔ جسے پری میٹرک کہہ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں ساتویں اسٹینڈرڈ کو میٹرک کہتے تھے۔ گویا اسکول چھوڑتے وقت انہوں نے میٹرک پاس نہیں کیا تھا۔ میٹرک کے معیار کا قانون کے کالج میں داخلہ کا امتحان انہوں نے لندن جاکر پاس کیا۔

بچپن کی عادتیں

مشہور مثل ہے، پُوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ محمد علی کے ساتھ بھی یہی صورت تھی۔ سب بچوں کی طرح ان کو کھیل سے بھی دلچسپی تھی۔ پتنگ بازی کا شوق بھی تھا۔ خوب کھیلتے تھے۔ لیکن کھیل میں بھی وہ دوسرے بچوں کی کپتانی کرتے تھے اور کھیلتے وقت کبھی کھیل کے اصولوں کو نہیں توڑتے تھے نیو نہم روڈ کے دوسرے بچے مٹی اور گرد میں کھیلتے اور لوٹتے رہتے تھے لیکن محمد علی کرکٹ کھیلنا پسند کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنے دوستوں کو مٹی میں گولیاں کھیلنے سے منع کیا اور اپنا گیند بلّا دے کر کہا کہ اس سے کھیلو۔

پڑھنے میں ان کی دلچسپی اس حد تک تھی کہ خواہ کتنی رات ہو جاتے جب تک وہ اس دن کا کام ختم نہ کر لیتے نہ سوتے۔ چونکہ

گھر چھوٹا تھا تو اس خیال سے کہ دوسروں کی نیند خراب نہ ہو وہ لالٹین کے آگے گتہ لگا لیتے اور دیر تک پڑھتے رہتے۔ ایک بار وہ رات گئے تک پڑھنے میں مصروف تھے ان کی ایک رشتہ دار خاتون کی آنکھ کھلی۔ ننھے محمد علی کو اتنی دیر تک پڑھتے دیکھ کر حیران ہوئیں۔ پیار سے کہنے لگیں "بیٹے! اتنی دیر تک نہ پڑھا کرو۔ صحت خراب ہو جائے گی"۔ محمد علی نے ادب سے جواب دیا۔"بائی جی، زیادہ" نہیں پڑھوں گا تو بڑا آدمی کیسے بنوں گا"۔

محنت اور جز رسی کی عادت میں وہ اپنے والد کے نقش قدم پر تھے وہ اپنے پیسوں اور چیزوں کا پورا حساب رکھتے تھے اور سوچ کر احتیاط سے خرچ کرتے تھے۔ بچپن کی یہ عادت ان میں تمام زندگی رہی۔ فضول خرچ نہ وہ پیسے کو کرتے تھے اور نہ وقت کو۔

تیسری عادت جو بچپن ہی میں بہت نمایاں تھی وہ ان کی شائستگی اور نفاست پسندی تھی۔ بہت صاف ستھرے رہتے تھے۔ کپڑے خواہ کیسے ہی ہوں وہ انہیں بہت اچھے طریقے سے پہنتے تھے۔

پہلی شادی

۱۸۹۲ء کے شروع میں محمد علی جناح بھائی کی شادی بمبئی کے مشہور تاجر، لیرا کھیم جی کی بیٹی، ایمی بائی سے ہوئی۔ بارات پورے اہتمام سے کراچی سے کشتیوں کے ذریعہ لیرا کھیم جی کے آبائی

گاؤں ہریانہ گئی - جو کاٹھیاواڑ کے قصبے جام نگر سے کچھ فاصلے پر ہے اور شادی کی رسومات امیرانہ شان سے ادا کی گئیں ۔ اس وقت محمد علی کی عمر بمشکل سولہ برس کی تھی اور انہوں نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی ۔ دُلہن اس سے بھی کم عمر کی تھیں ۔ اصل میں یہ رسمی شادی محمد علی نے اپنی پیاری ماں کے اصرار پر کی تھی ۔ جو انہیں پیار سے محمد کہا کرتی تھیں ۔ لڑکی کا انتخاب بھی ان ہی کا تھا ۔ محمد علی جناح کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ان کی ساری زندگی میں غالباً یہ تنہا اہم فیصلہ تھا جو ان کے لیے کسی اور نے کیا اور جسے انہوں نے سعادت مندی سے قبول کیا یہ ایمی بائی اگلے سال ان کے لندن روانہ ہونے کے کچھ دنوں بعد ہی (یا ایک روایت کے مطابق چند سال بعد) انتقال کر گئیں ۔

میسرز جناح بھائی اینڈ کمپنی

جناح پونجا ایک عملی انسان تھے انہوں نے محنت ، ذہانت اور حوصلے سے اتنا کچھ حاصل کیا تھا ۔ ہر چند کہ اب ۱۸۹۲ء میں ان کے کاروبار کی وہ حالت نہیں رہی تھی جو کچھ سال پہلے تھی ۔ پھر بھی ان کے ارادے بلند تھے ۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کو بھی ایک بڑا تاجر بنانا چاہتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے محمد علی کے لیے وسط ۱۸۹۲ء میں میسرز جناح بھائی اینڈ کو کے نام سے ایک فرم کھول دی ۔ اس زمانے میں محمد علی جناح چرچ مشن میں انگریزی کے چھٹے درجے کے طالب علم

تھے۔ اس کمپنی نے اگست ۱۸۹۲ء میں کام شروع کیا۔ محمد علی جناح نے اپنی فرم کے لیے نومبر ۱۸۹۲ء تک اپنے دستخطوں سے دو چیک ہنڈیوں کی شکل میں کاٹے جن کا ریکارڈ موجود ہے۔ ۳۱ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو انہوں نے چرچ مشن اسکول چھوڑ دیا۔ غالباً سارا وقت تجارتی فرم کو دینے کا خیال تھا۔

انگلستان کو روانگی

جنوری ۱۸۹۳ء میں محمد علی جناح بحری جہاز سے انگلستان روانہ ہوتے۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی تجارتی فرم کو فروغ دینے کے لیے۔ ۱۸۹۳ء تک اس فرم نے کچھ کاروبار بھی کیا لیکن اس کے بعد کام بالکل ختم ہو گیا۔ کراچی میں جناح پونجا کی اپنی تجارتی کمپنی دیوالیہ ہو چکی تھی۔ اب محمد علی کے سامنے دو راستے تھے یا خالی ہاتھ واپس آجاتے یا وہاں کچھ کرتے۔ زندگی میں پہلا اہم فیصلہ کرنے کا وقت آگیا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ انہوں نے اپنے والد جناح پونجا سے مشورہ بھی کیا ہو گا کہ اب کیا کریں۔ بہر حال خواہ حالات نے مجبور کیا ہو خواہ کسی نے مشورہ دیا ہو ہوا یہ کہ نوجوان محمد علی جناح بھائی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے۔ قانون کے کالج میں داخلے کے لیے انہیں میٹرک کے معیار کا داخلہ کا امتحان بھی پاس کرنا تھا۔ مئی ۱۸۹۳ء میں انہوں نے دن رات محنت کر کے داخلہ کا امتحان پاس کر لیا اور ۵ جون ۱۸۹۳ء کو لندن کے قانونی تعلیم کے ادارے لنکنز اِن میں داخلہ لے لیا۔

لندن میں قانون کی تعلیم کے ادارے اور بھی بہت سے تھے۔ لنکنز ان میں داخلہ لینے کی ایک خاص وجہ تھی۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے کچھ عرصہ قبل کراچی بار ایسوسی ایشن کے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوتے قائداعظم نے خود اس امر کی وضاحت کی۔ انہوں نے فرمایا:

"ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے دل میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جنکا شمار دنیا کے عظیم مدبروں میں ہوتا ہے، بہت عزت تھی۔ ایک دن میں اتفاق سے لنکنز ان گیا۔ اس کے صدر دروازہ پر دنیا کے نامور قانون سازوں کے نام کندہ تھے اور سرفہرست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی تھا۔ میں اس ادارہ سے متاثر ہوا اور میں نے اس میں داخلہ لے لیا۔"

انگلستان میں طالب علمی کا زمانہ

انگلستان کے شدید موسم، تنہائی اور وسائل کی کمی کو انہوں نے حوصلے سے برداشت کیا۔ وہ جس گھر میں کرائے پر رہتے تھے اس میں گرم پانی کا انتظام نہیں تھا۔ ٹھنڈ بہت ہوتی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔

صبح سویرے اٹھنا، غسل کرنا اور دوسرے کاموں کو ایک خاص قاعدے سے وقت پر کرنا لندن میں بھی جاری رکھا۔ لندن پہنچنے کے چند ماہ بعد ہی انہیں دو جذباتی صدمے بھی برداشت کرنے

پڑے ۔ ایک تو انہیں اپنی پیاری والدہ کی رحلت کی خبر ملی۔ اور دوسرے وہ بی بی جسے انہوں نے اپنی ماں کی خوشی کے لیے اپنایا تھا وہ بھی نہ رہی ۔ یہ دونوں صدمے انہوں نے حوصلے سے برداشت کیے اور اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں جان و دل سے منہمک رہے ۔ لیکن وہ کتابی کیڑے بھی نہیں تھے ۔ دوسری اہم غیر نصابی سرگرمیوں میں پوری طرح حصہ لیتے تھے۔ لندن کے سب سے بڑے کتب خانے ، برٹش میوزیم میں مطالعہ کا پاس ان کے پاس تھا ۔ برطانوی پارلیمنٹ (ہاؤس آف کامنز) کے مباحث وہ بہت دلچسپی سے سنتے تھے۔ اولڈ وک تھیٹر میں شیکسپیئر کے ڈرامے بہت شوق سے دیکھتے تھے ۔ ایک بار انہیں خود بھی اداکاری کرنے کا خیال آیا۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ لندن میں طالب علمی کے زمانے میں محمد علی جناح نے مشہور قوم پرست رہنما دادا بھائی نوروجی کی انتخابی مہم میں ایک پُرجوش کارکن کی حیثیت سے حصہ لیا۔ اور دادا بھائی سے ان کا قریبی تعلق رہا ۔ اس بیان کا پہلا حصہ تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں۔ اگست ۱۸۹۲ء میں دادا بھائی کا انتخاب ختم ہو چکا تھا اور وہ ہاؤس آف کامنز میں بحیثیت ایک آزاد ممبر کے اپنی نشست سنبھال چکے تھے۔ اس لیے اُن کی انتخابی مہم میں حصہ لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دادا بھائی نوروجی سے ارادت کی بات البتہ صحیح ہے۔ دادا بھائی باوقار شخصیت کے آزاد

خیال قوم پرست رہنما تھے ۔ انگلستان یوں بھی ان دنوں آزاد خیالی (لبرل ازم) کی زد میں تھا۔ نوجوان اور ذہین جناح لبرل قوم پرستی کے خیالات سے متاثر ہوتے ۔ غالباً اسی زمانے میں انہوں نے اپنی زندگی کا دوسرا اہم ترین فیصلہ بھی کیا ۔ یعنی ہندوستان کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے کا فیصلہ ، انہیں اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہندوستان کو اپنی آزادی کے لیے متحد ہو کر زبردست جدوجہد کرنا پڑے گی ۔ اس جدوجہد آزادی میں وہ خود ایک اہم کردار ادا کرنا چاہتے تھے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے یہاں تک کہا " میری خواہش ہے کہ میں لندن میں قیام کروں اور پارلیمنٹ کا رکن بن جاؤں ۔ اور انگریز مدبروں سے برابر کی سطح پر ملوں"

یہ خیالات و احساسات بڑے حیرت انگیز معلوم ہوں گے اگر یہ ذہن میں رکھا جائے کہ اس عزم اور حوصلے کا اظہار کرنے والا ایک تاجر کا بیٹا ہے ۔ جو حالات کے تقاضے کے تحت قانون کی تعلیم حاصل کر رہا ہے اور جس کی عمر ابھی بیس سال بھی پوری نہیں ہونے پائی ۔ اپنی غیر معمولی ذہانت اور محنت کی وجہ سے محمد علی جناح بھائی نے قانون کا نصاب وقت سے بہت پہلے ختم کر لیا ۔ لیکن بعض رسمی تکلفات کی تکمیل کے لیے انہیں مزید ایک آدھ سال رکنا پڑا ۔ ۱۸۹۶ء کے شروع میں انہوں نے کالج کی کونسل کو درخواست دے کر اپنے نام سے بھائی کا لاحقہ حذف کرا دیا ۔ اب وہ ایم۔ اے۔

جناح لکھنے لگے تھے۔ ۲۹ اپریل ۱۸۹۶ء کو انہیں بیرسٹری کی ڈگری ملی۔اور واپس ہندوستان روانہ ہوئے۔

خُدا کی شان ہے وہ جو چاہے جس کو دے اور جس سے جو چاہے کام لے۔ موسٰی آگ لینے گئے تھے کہ پیغمبری ملی۔ ذات کے خوجے محمد علی جناح بھائی ایکسپورٹ کے کاروبار کو چمکانے اور جمانے انگلستان گئے تھے۔واپس آئے تو ایک روشن دماغ بیرسٹر تھے۔ قوم پرست، آزادی کے جذبے سے سرشار اور ایک نئی دنیا پیدا کرنے کا عزم لیے ہوئے۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

انگلستان سے واپسی

۱۸۹۶ء میں محمد علی جناح بار ایٹ لا ولایت سے کراچی واپس پہنچے۔ اس عرصے میں والد کا کاروبار بالکل تباہ ہو چکا تھا اور وہ مختلف مقدموں میں پھنسے ہوئے تھے۔اس لیے ان کی خواہش تھی کہ وہ کراچی میں کسی قانونی فرم سے متعلق ہو کر پریکٹس کریں۔اور ان کو سہارا دیں۔اس کا انہوں نے انتظام بھی کر لیا تھا۔ لیکن بیس سال کے اولوالعزم جناح کچھ اور سوچ رہے تھے۔ان کی نظریں افق کے اُس پار کی منزلوں پر تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بمبئی جا کر اپنی صلاحیتوں کو آزمائیں۔ عزیزوں اور دوستوں سب نے سمجھایا بھی لیکن وہ اپنا ارادہ

بدلنے پر تیار نہیں ہوئے۔ انہیں اپنے ارادے پر اعتماد تھا۔ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

بمبئی کے اپالو ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر اور فورٹ ایریا میں ایک چھوٹا سا دفتر قائم کر کے اور ہائی کورٹ میں نام درج کرا کے انہوں نے ۱۸۹۷ء میں کام تو شروع کر دیا لیکن پریکٹس برائے نام تھی۔ وہ ہوٹل سے کچہری تک پیدل آتے جاتے تھے۔ مقدمہ ملے یا نہ ملے وہ پابندی سے دفتر جاتے تھے اور بیشتر وقت قانونی کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتے تھے۔ مشکلوں اور آزمائش کا یہ صبر آزما دور تین سال تک جاری رہا لیکن ان کے حوصلے، وقار، یا معیار میں فرق نہ آیا۔ نہ کسی سے گلہ نہ شکایت زمانہ، ان صبر آزما حالات میں بھی اُنہوں نے اپنے سماجی تعلقات قائم رکھے۔ بمبئی کے اُونچے کلبوں میں آتے جاتے۔ ممتاز اور معزز گھرانوں کے یہاں دعوتوں میں شریک ہوتے۔ ان کی پُر وقار اور پُر اثر شخصیت کا ہر جگہ خیر مقدم کیا جاتا۔ خوش لباسی اور نفاست ان پر ختم تھی۔ یہ صفت ان میں تمام زندگی رہی صلاحیت اور محنت آخر کو رنگ لاتی ہے۔ بمبئی کا انگریز ایڈووکیٹ جنرل میک فرسن ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے انہیں اپنے ساتھ کام کرنے اور اپنی لائبریری میں مطالعہ کرنے کی دعوت دی۔ اپنے مقدمات بھی انہیں دیئے۔ ان مقدمات میں ان کی کارکردگی سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ جلد ہی انہیں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی ایک عارضی آسامی

پر مقرر کر دیا گیا۔ اس کام سے ان کی جوہر کھلے اور انکی شہرت اور تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ جب اس عارضی آسامی کی مدت ختم ہوئی تو یہ جگہ (اس زمانے کے) پندرہ سو روپے ماہوار کی مستقل ملازمت کے طور پر ان کو پیش کی گئی۔ لیکن قائداعظم نے یہ پیش کش شکریے کے ساتھ مسترد کر دی اور کہا، "میں اتنی رقم تو ایک دن میں کمانا چاہتا ہوں" اور انہوں نے یہ سچ کر دکھایا۔

۱۹۰۰ء میں پریذیڈنسی مجسٹریٹی چھوڑنے کے بعد انکی وکالت خوب چمکی۔ اور جب حالات اور بہتر ہو گئے تو انہوں نے والد اور دوسرے گھر والوں کو بمبئی ہی بلا لیا۔ اور خوجے محلے میں ان کی رہائش کا انتظام کیا۔

بحیثیت وکیل کے وہ قانونی مہارت ہی میں نہیں بلکہ اپنی بحث کے تجزیاتی انداز، استدلال اور بے باک انداز بیان کے لیے بھی شہرت رکھتے تھے۔ دیانت، فرض شناسی، حق گوئی میں بھی لاثانی تھے۔ طے شدہ معاوضے سے ایک پیسہ بھی زائد نہیں لیتے تھے اور پوری تندہی اور تیاری کے ساتھ مقدمے لڑتے تھے۔ اس زمانے میں انگریز جج اور مجسٹریٹ ہندوستانی وکیلوں کے ساتھ اکثر بد دماغی اور بدتمیزی سے پیش آتے تھے۔ محمد علی جناح ان کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کی اخلاقی جرأت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ وہ ان کے رویے کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ بد دماغ ججوں سے ان کی جھڑپ کے کئی قصے مشہور ہیں۔

اپنی مالی حالت کو مستحکم کرتے ہی انہوں نے عملی سیاست میں بھی دلچسپی
لینا شروع کر دی۔ وہ سفر شروع ہو چکا تھا جو آیندہ پچاس برس جاری رہا

سیاسی جدوجہد کی داستان

۱۹۰۵ء میں قائداعظم کانگرس کے ممبر بنے۔ ۱۹۰۶ء کے کانگرس کے اجلاس میں انہوں نے دادا بھائی نوروجی کے اعزازی سیکرٹری کی حیثیت سے انجام دیں۔ ۱۹۰۹ء میں مسلم لیگ کی کوشش سے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملا تھا۔ ۱۹۰۹ء کے اسی قانون کے تحت قائداعظم بمبئی کے ایک مسلم حلقۂ انتخاب سے وائسرائے کی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے ۱۹۰۰ء سے ان کی وکالت کا شہرہ برابر بڑھ رہا تھا اور اسی نسبت سے ان کی خوشحالی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس خوشحالی میں انہوں نے اپنے گھر والوں کو برابر کا شریک کیا۔ اپنے بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات خود برداشت کیے۔ ان کے لیے والدین کا کردار ادا کیا۔ اس زمانے میں ایک ایسا واقعہ ہوا جو قابلِ ذکر ہے۔ ان کی چھوٹی بہن رحمت بائی کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ بمشکل ایک اچھا رشتہ ملا۔ لیکن جب جناح پونجا کو پتہ چلا کہ لڑکا اسمٰعیلی خوجہ نہیں بلکہ سُنی خوجہ ہے۔ تو انہوں نے رشتے سے انکار کر دیا۔ وہ برادری کے ردِ عمل سے ڈرتے تھے۔ آخر کار محمد علی جناح نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جب ہر

طرح سے لڑکے کے بارے میں اطمینان کرلیا تو باپ سے کہا "سنی ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لڑکا ہر طرح سے موزوں ہے"۔ باپ نے پھر برادری سے نکالے جانے کے اندیشے کا تذکرہ کیا۔ محمد علی نے آغا خان سے بات کی۔ ان کی یقین دہانی سے رحمت بائی کی شادی جمال خاندان میں برادری سے باہر ہو گئی۔ اس واقعہ سے محمد علی جناح کی معاملہ فہمی، حقیقت پسندی اور مذہبی بے تعصبی پر روشنی پڑتی ہے۔ ذاتی بات ہو یا خاندان کی، یا قوم کی، ہر صورت میں اور ہمیشہ وہ معقولیت اور بے تعصبی کی راہ اختیار کرتے تھے۔

امپیریل کونسل میں وہ جوش و خروش سے گوکھلے کے ساتھ کانگرسی نقطہ نظر کی حمایت کرتے تھے۔ گوکھلے ہی نے انکی آزادی پسند غیر فرقہ واریت کی تعریف کرتے ہوئے انہیں ہندو مُسلم اتحاد کے سفیر کا خطاب دیا تھا۔ سیاست میں گوکھلے، سر سُرندر ناتھ بنرجی اور دادا بھائی ان کے ہیرو تھے۔ وہ دل و جان سے آزادی کی منزل کو قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے اور چونکہ ان کے خیال میں آزادی ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے ہی سے مل سکتی تھی اس لیے وہ ہندو مسلم اتحاد کے بھی پُر جوش حامی تھے۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی۔ جناح اس کے باقاعدہ ممبر نہیں تھے۔ لیکن مسلم لیگ سے ان کا رابطہ قائم تھا۔ مسلم لیگ کے ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء کے اجلاس میں انہوں نے شرکت کی۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے دستور میں ترمیم ہوئی اور قائداعظم کی کوشش سے مسلم لیگ نے بھی حکومت

خود اختیاری (سیلف گورنمنٹ) کی قرار داد منظور کی اور ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔ ۱۹۱۳ء ہی میں قائداعظم، مولانا محمد علی اور وزیر حسن کے کہنے پر مسلم لیگ کے باقاعدہ ممبر بن گئے اس شرط کے ساتھ کہ مسلم لیگ کی رکنیت کانگرس کی رکنیت سے کسی طرح مزاحم نہیں ہو گی. کانگریس اور مسلم لیگ ، دونوں سیاسی جماعتوں نے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ پیش کر دیا تھا۔ قائداعظم نے اپنی دو جماعتی رکنیت کو ان دو بڑی سیاسی تنظیموں کے درمیان مفاہمت اور اتحاد کے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اُنہی کی کوشش سے دسمبر ۱۹۱۵ء میں لیگ اور کانگرس کا مشترکہ سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ حکومت اس اتحاد سے خائف تھی۔ چنانچہ بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن نے ذاتی دلچسپی لے کر اس اجلاس کو درہم برہم کروا دیا۔ لیکن بعد کو یہ مشترک اجلاس ہو کے رہا۔ یہ بھی جناح کی کامیابی تھی۔ یہیں سے ان کے اور ولنگڈن کے درمیان تعلقات خراب ہوئے۔ مسلم لیگ کے اس اجلاس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں آزادی کے مطالبے کے پیشِ نظر قائداعظم نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اور دونوں قوموں میں اتحاد کے لیے ایک مشترکہ کمیٹی بنانے کی جو قرار داد پیش کی تھی اس کی تائید میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مدلل اور موثر تقریر کی تھی۔ دونوں جماعتوں کا مشترکہ اجلاس پھر ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں ہُوا۔ لکھنؤ کے اس اجلاس میں کانگرس اور مسلم لیگ کی مفاہمت "معاہدہ لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد

کرایا۔ جس کی رسم افتتاح ممتاز رہنما خاتون اور شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو نے ان کی عدم موجودگی میں ادا کی اور انہیں لندن میں تار بھیجا کہ ایک پیغمبر کو اس کے اپنے ملک میں اور اپنی زندگی میں اعزاز مل گیا۔

پہلی جنگ عظیم جاری تھی جنگی کوششوں میں ہندوستانیوں نے مشروط تعاون بھی کیا تھا۔ لیکن معاہدۂ لکھنؤ کے اثر سے اور ہوم رول لیگ کی سرگرمیوں میں سے آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی تھی۔ احتجاجی مظاہرے بھی ہونے لگے ان سے نپٹنے کے لیے حکومت نے ۱۹۱۸ء میں رولٹ بل پیش کیا جس میں بنیادی شہری حقوق سلب کرلیے گئے۔ قائداعظم نے امپیریل کونسل میں اس کالے قانون کی ڈٹ کر اور موثر انداز میں مخالفت کی۔ اور جب اسے ۱۹۱۹ء میں ایک ایکٹ (قانون) کی حیثیت دے دی گئی تو انہوں نے احتجاجاً کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ عوام و خواص ۸ جولائی کی مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم یا اصلاحات سے خوش نہیں تھے جس میں معاہدۂ لکھنؤ کے مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف تمام ملک میں شدید احتجاج کیا گیا۔ حکومت نے بھی اپنی پوری طاقت اس احتجاج کو دبانے میں صرف کر دی اس جارحانہ پالیسی کا بدترین اور ہولناک مظاہرہ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہوا۔ اور پنجاب میں سخت ترین مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ لیکن جبر و تشدد کی ہر کارروائی سے عوامی مدافعت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس زمانے میں گاندھی کانگریسی سیاست کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے تھے انہوں نے ہوم رول لیگ کو اپنے

زیر اقتدار لانا چاہا۔ قائداعظم نے ہوم رول لیگ سے استعفیٰ دے دیا۔ گاندھی سے ان کے اختلافات کھل کر سامنے آئے۔ گاندھی و جناح متضاد شخصیتوں، متضاد طرز فکر اور اصولوں کے حامل تھے۔ سیاست کے ان دو دیو پیکروں کا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں ترکی میں خلافت کو بچانے کے لیے مولانا محمد علی اور دوسرے مسلمان لیڈروں نے تحریک خلافت شروع کی جس کی قیادت گاندھی کے ہاتھ میں آگئی۔

نان کوآپریشن موومنٹ تحریک عدم تعاون اور تحریکِ ہجرت شروع کی گئی۔ محمد علی جناح نے اسی سال اکتوبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی اور کانگریس کی آمریت کے خلاف کانگرس سے استعفیٰ بھی دے دیا وہ تحریکِ خلافت سے اختلاف کرنے میں تنہا تھے۔ لیکن بعد کو ان تحریکوں کی ناکامی اور مسلمانوں کو ان سے پہنچنے والے نقصان نے ثابت کر دیا کہ قائداعظم کا نقطۂ نظر ٹھیک تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ انھوں نے تحریک عدم تعاون سے اختلاف ضرور کیا۔ گاندھی کی مخالفت بھی کی لیکن اس تحریک یا اس کے لیڈروں کے خلاف حکومت سے تعاون نہیں کیا جب حکومت نے گاندھی کے مخالفین کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی تو ایک بیان میں کہا کہ عدم تعاون کی تحریک عام بے اطمینانی کی ایک علامت یا اظہار ہے۔ یہ بے اطمینانی رائے عامہ اور بڑے بڑے مسئلوں کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ قائداعظم اصولی جنگ لڑتے تھے اور اصول کی خاطر عوام اور خواص دونوں سے اختلاف کرنے اور اس کا برملا اظہار کرنے کا حوصلہ

رکھتے تھے۔ تحریکِ خلافت میں ان کا کردار ان کی سیاسی فراست اور اخلاقی جرأت کے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

ستمبر ۱۹۲۳ء میں وہ اپنے پرانے حلقے سے امپیریل کونسل کی سیٹ کے لیے پھر کھڑے ہوئے۔ اپنے انتخابی منشور میں انھوں نے لکھا "میں کسی عہدے یا خطاب کا خواہاں نہیں ہوں میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی تمام تر صلاحیتیں ملک کی خدمت کے لیے وقف کر دوں"۔ اس وقت کانگریس اور گاندھی سے ان کے شدید اختلافات موجود تھے۔ اس کے باوجود ۱۹۲۴ء میں لیگ کے لاہور کے اجلاس میں قائداعظم نے ایک بار پھر معاہدۂ لکھنؤ کے انداز پر ہندو مسلمانوں میں اتحاد و تعاون پر زور دیا۔ اسی اجلاس میں ایک کمیٹی بھی مقرر کر دی گئی۔ جو دوسری جماعتوں کے تعاون سے دستوری اصلاحات کی ایک اسکیم مرتب کرے۔ قائداعظم کو اب بھی یقین تھا کہ جب تک ہندوستان کے عوام متحد نہ ہوں گے یہ ملک غیر ملکی تسلّط اور غلبے کا شکار رہے گا۔

دوسری طرف اتنے ہی خلوص اور دیانت داری سے وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس اتحاد میں مسلمانوں کے جائز مفادات محفوظ رہیں۔ کانگریس ان کی اتحاد کی کوششوں سے اتفاق کرتی تھی لیکن مسلمانوں کے حقوق کی بات سے بدکتی تھی۔ دائیں بازو کے مسلمان ان کی اتحاد کی کوششوں سے انہیں ہندو نواز سمجھتے تھے۔ حکومت ان کی وطن پرستی اور آزادی کی جدوجہد سے نالاں تھی۔ ہندو فرقہ پرست شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں چلا رہے تھے۔ جولائی ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک ہندوستان کے مختلف گوشوں میں خوفناک

ہندو مسلمان فسادات بھڑک اُٹھے جن میں زیادہ تر نقصان مسلمانوں کا ہوا۔
فسادات کا اصل سبب ہندوؤں کا مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح
کرنے کا رویّہ تھا۔

دسمبر ۱۹۲۵ء میں وزیر ہند نے اعلان کیا تھا کہ ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ
انڈیا ایکٹ کے تحت جلد از جلد آئینی اصلاحات کا جائزہ لینے کے لیے
ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ ۱۹۲۷ء میں سر جارج سائمن کی سربراہی میں
یہ کمیشن ہندوستان آیا۔ جس کی نمائندہ حیثیت نہیں تھی۔

سائمن کمیشن کی غیر نمائندہ حیثیت کے خلاف بحیثیت مجموعی تمام
ملک میں احتجاج کیا گیا۔ احتجاج کرنے اور کمیشن سے تعاون نہ کرنے کی
مہم میں جناح سب سے آگے تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں دو بنیادی
تجویزیں بھی پیش کیں۔ اوّل یہ کہ تمام فرقے اپنے سیاسی اختلاف طے
کریں۔ دوم سب فرقے اتفاق رائے سے ایک مسودہ آئین مرتب کریں پھر
ایک مشترکہ کنونشن میں اُسے منظور کر کے اس آئین کے نفاذ کے لیے جدوجہد کریں۔
۳۱، مارچ ۱۹۲۸ء کو کمیشن اپنے طور پر کام کر کے واپس چلا گیا۔ قائداعظم
نے کمیشن کے خلاف جدوجہد میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دی تھیں۔
۵، مئی ۱۹۲۸ء کو وہ خود بھی انگلستان روانہ ہو گئے تاکہ کچھ آرام کر
سکیں۔ کمیشن کے سامنے متفقہ آئینی مطالبات پیش کرنے کی خواہش
پوری نہیں ہو سکی۔ حالانکہ وہ ۲۰، مارچ ۱۹۲۷ء کی دہلی کانفرنس میں مسلمانوں
کے کم از کم مطالبات پیش کر چکے تھے۔ جس میں علیحدہ انتخابات کا حق تک

بعض شرائط کے ساتھ چھوڑنے پر آمادگی ظاہر کی گئی تھی ۔ کانگرس نے قائداعظم کی مسلم تجاویز پر غور کرنے کے لیے جو نہرو کمیٹی مقرر کی تھی اس نے بے حد تنگ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمانوں کے کم از کم اور نہایت جائز مطالبات کو بھی مسترد کر دیا ۔ جناح ۶ ، اکتوبر ۱۹۲۸ء کو انگلستان سے واپس آئے ۔ تو انہیں نہرو رپورٹ سے بہت مایوسی ہوئی تاہم وہ آئینی مسئلہ پر ہندو مسلم اتحاد کو اتنا اہم سمجھتے تھے کہ انہوں نے کمیٹی کو متبادل تجاویز پیش کیں ۔ لیکن کانگرس نہ مانی ۔ چنانچہ مسلم لیگ نے مارچ ۱۹۲۹ء میں نہرو رپورٹ مسترد کر دی اور خود مسلم پوزیشن کو ۱۴ نکات میں پیش کر دیا ۔ جو تاریخ میں قائداعظم کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہیں جن میں بعض یہ ہیں ۔

۱۔ جداگانہ انتخاب کا حق منظور کیا جائے ۔

۲۔ تمام فرقوں کو مذہبی آزادی دی جائے ۔

۳۔ سندھ کو علیحٰدہ صوبہ بنایا جائے ۔

۴۔ سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں بھی اصلاحات نافذ کی جائیں ۔

۵۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ایک تہائی سے کم نمائندگی نہ دی جائے ۔

۶۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی ملے ۔

۷۔ مسلمانوں کی تعلیم کو ترقی دی جائے ۔

۸۔ ان کی زبان مذہب اور شخصی قوانین کو فروغ دیا جائے ۔

۹۔ مسلمانوں کی تہذیب کے تحفظ کے لیے دستور میں مناسب ضمانت دی جائے۔

۱۰۔ تمام مرکزی اور صوبائی حکومت میں مسلمانوں کو ایک نمائندگی دی جائے۔

قائدِاعظم کے چودہ نکات بڑے فراخدلانہ تھے۔ان تحفظات کے ساتھ وہ وفاقی آئین قبول کرنے پر تیار تھے لیکن ہندو کانگرس مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے ان کے جائز حقوق کی ضمانت دینے کو تیار نہیں تھی۔

اقبال کا تاریخی خطبہ

اس سیاسی پس منظر میں دسمبر ۱۹۳۰ء میں یوپی کے مشہور شہر الٰہ آباد میں جو کانگرس کا قلب تھا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔اس اجلاس میں علامہ اقبال نے ایک تاریخی خطبہ پڑھا جس میں آپ نے ہندوستان کی آیندہ دستوری ترقی کا خاکہ پیش کیا۔ اُنھوں نے بڑی جرأت سے اعلان کیا، ”ہندوستانی مسلمانوں کو اگر یہ یقین دلا دیا جائے کہ پنجاب سندھ، سرحدی صوبے اور بلوچستان کو آپس میں ملا کر مسلمانوں کے لیے ایک اسلامی ریاست بنا دی جائے گی تو میں آزادی کے لیے ہر شے قربان کرنے کو تیار ہوں۔ اقبال نے اس خطبے میں متحدہ قومیت کے نظریے کو مکمل طور پر مسترد کر دیا اور کہا:

”مجھے یہ نظر آرہا ہے کہ شمال مغرب میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کا مقدر بن چکا ہے۔

اس لیے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ ہندوستان اور اسلام کے مفاد کے پیش نظر ایک متحدہ اسلامی مملکت قائم کی جائے"۔

چودہ نکات کے مسترد ہونے کے بعد اگلا منطقی قدم یہی تھا کہ مسلم قومیت کے تحفظ کے لیے علیحدہ ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا جائے۔ لیکن یہ اقبال کا ذاتی خیال تھا۔ مسلم لیگ اب بھی چودہ نکات کی بنیاد پر کانگریس سے مفاہمت پر آمادہ تھی۔

گول میز کانفرنس

سائمن کمیشن کی ناکامی کے بعد قائداعظم نے برطانوی وزیراعظم میکڈانلڈ کو خط لکھا کہ حکومت کمیشن کی رپورٹ پر فیصلہ کرنے سے پہلے مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور موقف پر "سنجیدگی" سے غور کرے اور تجویز پیش کی کہ حکومت تمام متعلقہ پارٹیوں کی ایک کانفرنس بلائے اور نئے سرے سے آئینی مسائل کا جائزہ لے اور اس کانفرنس کے فیصلوں کی روشنی میں نئی آئینی اصلاحات مرتب کی جائیں۔ ۱۴۔ دسمبر ۱۹۳۰ء کو یہ آئینی کانفرنس لندن میں شروع ہوئی۔ اس کے ۵۷ ہندوستانی نمائندوں میں سے ۱۶ مسلمان تھے۔ جن میں سے قائداعظم، آغا خان مولانا محمد علی کے نام قابل ذکر ہیں۔ قائداعظم کی انتہائی کوششوں کے باوجود ہندو لیڈر مفاہمت کے لیے تیار نہ ہوتے اور کانفرنس ۱۹۔ جنوری ۱۹۳۱ء کو ختم ہوئی۔ قائداعظم لندن میں ہی ٹھہرے رہے اور آغا خان کے ساتھ ہندو وفد سے گفت وشنید کرتے رہے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ہندو

کسی قیمت پر مسلمانوں کی علیحدہ قومی حیثیت قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔
آزادی کی خاطر قائدِاعظم زیادہ سے زیادہ رعایت دینے پر تیار تھے۔ لیکن
ہندؤں کو یقین تھا کہ وہ سیاسی لحاظ سے مضبوط پوزیشن میں ہیں اور انہیں
درپردہ انگریزوں کی حمایت بھی حاصل ہے۔ اس لیے وہ مسلمانوں کے علیحدہ
انتخاب کا حق تک ماننے کو تیار نہ تھے۔ کانگریس اور ہندو لیڈروں کے رویے
سے قائدِاعظم کو سخت مایوسی ہوئی۔

ستمبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی اس بار قائداعظم
نے گاندھی سے براہ راست مذاکرات کیے۔ لیکن گاندھی کانگریس کے متحدہ
قومیت کے نظریے پر اڑے رہے اور مذاکرات ناکام ہوئے۔ دوسری گول میز
کانفرنس میں علامہ اقبال بھی شریک تھے۔ اس کانفرنس کے موقعہ پر اس کے
بعد جناح اقبال کے سیاسی خیالات سے تفصیل سے مستفید ہوئے۔ قیاس
کہتا ہے کہ اقبال نے جناح کو اپنے الہ آباد کے خطبے کے تصورات سے
آگاہ کیا ہوگا۔ چونکہ ہندؤں سے آئینی مفاہمت کے امکانات تقریباً ختم
ہو چکے تھے اور قائداعظم گاندھی اور دوسرے ہندو مہاسبھائی لیڈروں کی
ذہنیت سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس پسِ منظر میں قائداعظم نے اقبال کے مکمل
طور پر علیحدہ آزاد مسلم ریاست کے قیام کے نظریے پر ضرور سنجیدگی سے غور
لیا ہوگا۔ ادھر اقبال کو بھی قائداعظم کی شخصیت اور قائدانہ صلاحیت کو قریب
سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہوگا۔ اسی دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر ایک
اور چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جو اس وقت تو چائے کی پیالی میں طوفان ہی

نظر آتا تھا لیکن درحقیقت ایک بڑے حقیقی طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ و
واقعہ یہ تھا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے ایک مسلمان طالب علم چوہدری رحمت ع
اپنے چند دوستوں کے ساتھ اقبال سے ملے اور انہوں نے کانفرنس کے شر
کو بھی ایک یادداشت پیش کی جس میں متحدہ قومیت کے نظریے کو مکمل طو
پر رد کیا گیا تھا اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان کو تقسیم کرنے کی تجو
پیش کی گئی تھی۔ اس پمفلٹ میں مسلمانوں کی اس مملکت کا نام "پاکستان
بھی تجویز کیا گیا تھا۔ گول میز کانفرنسیں ناکام ہوگئیں لیکن اس سے بہت دو
رس نتائج برآمد ہوتے۔ قائداعظم نے دونوں گول میز کانفرنسوں میں جو خدما
انجام دیں اس پر مسز سروجنی نائیڈو نے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے
لکھا ہے۔

"مقناطیسی شخصیت موثر انداز بیان اور متوازن و معتدل لہجہ، یہ تھے
ان کے تین سرمائے۔ ان میں ایک ذہین وکیل کے تمام اوصاف موجود تھے اور
گول میز کانفرنس نے انہیں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع دیا تھا۔ دلائل پیش
کرنے میں ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوت فیصلہ اس وقت ظاہر ہوتی ہے
جب وہ کسی کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہوں"۔

انگلستان میں قیام

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد کی سیاسی صورت حال سے مایوس ہوکر
قائداعظم نے انگلستان ہی میں ٹھہرے رہنے کا فیصلہ کیا اور پریوی کونسل میں

مقدمات کی پیروی کی غرض سے لندن کے دہائٹ ہال کورٹ میں رہائش اختیار کرلی۔ ۳۱ مارچ کو قائدِ اعظم نے لندن سے آسام کے عبدالمتین چودھری کے نام ایک خط میں لکھا کہ موجودہ حالات میں، میں یہاں رہ کر زیادہ مفید کام کرسکتا ہوں۔ سیاست کا مرکز یہاں ہے۔ دو تین سال میں ہندوستان کی آئینی اصلاحات کے ڈرامے میں یہاں نہایت اہم سرگرمیاں شروع ہوں گی۔ ستمبر ۱۹۳۱ میں وہ کچھ دنوں کے لیے ہندوستان آئے بھی لیکن ہندوؤں کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ حالات کے جائزے سے مایوس ہوکر واپس لندن چلے گئے اور پریوی کونسل میں وکالت جاری رکھی۔ بالآخر عبدالمتین چودھری اور لیاقت علی خان کے اصرار اور اس یقین دہانی پر کہ مسلمانوں کی اکثریت ان کی رہنمائی کی خواہاں ہے اور متوقع دستوری اصلاحات کے پس منظر میں ان کی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ قائدِ اعظم اپریل ۱۹۳۴ء میں ہندوستان واپس آئے اور آتے ہی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس سال آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوتے انھوں نے مسلمانانِ ہند سے اپیل کی کہ وہ اپنے اختلافات بھلا کر مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں کیونکہ مسلم لیگ ہی مسلم قوم کے حقوق و مفادات کا تحفظ کر سکتی ہے۔

اکتوبر ۱۹۳۴ء، قائدِ اعظم بمبئی میں اپنے پرانے حلقہ انتخاب سے بلا مقابلہ مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے اور اسمبلی میں مسلم ممبروں کی قیادت سنبھال لی۔ اسمبلی میں پھر انھوں نے مفاہمت کی کوشش کی۔ انکی بار بار کوششوں کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ آزادی کو سب سے مقدم سمجھتے تھے اور آزادی ان کے خیال میں بغیر فرقہ وارانہ

مفاہمت کے حاصل نہیں ہو سکتی تھی لیکن جب وہ بھی مسلمانوں کے مفادات کے آئینی تحفظ کی بات کرتے تھے ہندوان پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے تھے ۔

۱۹۳۵ء کے اوائل میں انہوں نے بمبئی کے ایک جلسہ میں اعلان کیا۔

"ہندوؤں کو اپنی ذہنیت بدلنا ہوگی۔ جب یہ عظیم ملک آزاد ہوگا تو کیا ہم ہندوؤں کے محکوم بنیں گے؟ اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت نہیں بلکہ ہندوستانی حکومت قائم ہوگی۔ جس میں مسلمانوں کو نہ صرف اپنا منصفانہ اور جائز حصہ ملے گا بلکہ انہیں ہندوؤں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔"

اس بیان سے ظاہر ہوگا کہ مسلمان اس وقت بھی ۱۴ نکات پر مبنی بعض بنیادی آئینی تحفظات کے ساتھ وفاقی آئین قبول کرنے کو تیار تھے ۔ لیکن ہندو مسلمانوں کو انکی علیحدہ قومیت کی بنیاد پر انہیں آئینی تحفظ دینے کو تیار نہیں تھے ۔ گویا بنیادی مسئلہ متحدہ قومیت یا علیحدہ قومیت کا تھا ۔

۲۔ جولائی کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نافذ کر دیا گیا۔ اس سے سیاسی صورت حال یکسر بدل گئی۔ اس کے تحت مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہونے تھے اور صوبوں میں نمائندہ حکومتیں قائم ہونا تھیں۔ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں قائداعظم نے اس ایکٹ کی فیڈریشن والے حصے کی مذمت کی لیکن صوبوں سے متعلق حصے کو غنیمت جان کر لینے کی سفارش کی۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں لارڈ لنلتھگو وائسرائے نے انتخابات کی تاریخ مقرر کر دی ۱۹۳۶ء کے شروع تک مسلم لیگ ایک منظم جماعت نہیں تھی نہ ہی اس کا عام مسلمانوں سے گہرا رابطہ تھا۔ مسلمانوں کی آئینی جدوجہد کی تاریخ میں ایک اہم موڑ آگیا

تھا اقبال اور قائداعظم دونوں کو اس تاریخی لمحے کی اہمیت کا احساس تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں نے مختلف موقف اختیار کر رکھے تھے۔ پنجاب میں مسلمانوں کے لیڈر سر فضل حسین نے ہندوؤں سے مل کر یونینسٹ پارٹی بنائی تو سندھ میں بہت سے مسلمان سر عبداللہ ہارون کی قیادت میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ بنگالی مسلمانوں کی اکثریت بھی مولوی فضل الحق کی قیادت میں کرشک پرجا پارٹی کے ساتھ تھی۔ جس کے ممبر ہندو مسلمان دونوں تھے۔ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب اور خان عبدالغفار خان کھل کر قائداعظم اور مسلم لیگ کے مخالف تھے۔ البتہ مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں میں مسلم لیگ کے پرجوش حامی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ خاص طور پر یوپی، بہار اور بمبئی میں ان نامساعد حالات میں قائداعظم نے مسلم لیگ کو ملک گیر سطح پر منظم کرنے اور انتخابات لڑنے کے لیے لیگ کا پارلیمانی بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بہت بڑا قدم تھا جو پورے اعتماد کے ساتھ مستقبل پر نظر رکھ کے اٹھایا گیا تھا اس سلسلے میں علامہ اقبال قائداعظم کی مسلسل راہنمائی اور ہمت افزائی کر رہے تھے۔ جب جون ۱۹۳۶ء میں لاہور میں مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کا پہلا اجلاس ہوا تو اس میں اکثریتی صوبوں کے مسلمان رہنماؤں کی تعداد مایوس کن حد تک کم تھی۔ فروری ۱۹۳۷ء میں پہلے عام انتخابات ہوئے۔ کانگریس کو گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں مکمل اکثریت حاصل ہو گئی جبکہ مسلم لیگ نے کوئی خاص پوزیشن حاصل نہیں کی مسلمانوں کو بڑی تشویشناک صورت حال کا سامنا تھا۔ کانگریس اپنی طاقت کے نشے

میں سرشار تھی۔ علامہ اقبالؒ نے محسوس کیا کہ جب تک مسلم عوام لیگ میں شامل نہ ہوں گے وہ ہندوستانی سیاست میں اپنی جائز اہمیت نہیں منوا سکتی چنانچہ انہوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو وہ اہم تاریخی خط لکھا جس میں انہوں نے عام مسلمانوں کے مفادات کو بنیاد بنا کر لیگ کو منظم کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔

اقبال نے لکھا:

"لیگ کو آخر کار یہ طے کرنا ہو گا کہ آیا وہ اعلیٰ طبقے کے ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم رہے گی یا اس میں عام ہندوستانی مسلمانوں کو بھی شامل کیا جائے۔ جنہوں نے اب تک تنظیم سے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی ہے ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی ایسی سیاسی تنظیم عام مسلمانوں کو راغب نہیں کر سکتی جو ان کے حالات سنوارنے کے عزم کا اعلان نہ کرے نئے دستور کے تحت اعلیٰ عہدے اعلیٰ طبقے کے افراد کو اور چھوٹے عہدے وزیروں کے دوستوں یا عزیزوں کو ملتے ہیں، دوسرے معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے عام مسلمانوں کے حالات سنوارنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ عام مسلمانوں کی غریبی کا مسئلہ سنگین سے سنگین تر ہوتا چلا جا رہا ہے لیکن اس مسئلہ کو حل کرنے کا عزم کرے۔ اس مسئلے کا حل اسلام میں موجود ہے لیکن ایک آزاد اسلامی مملکت کے بغیر یہ حل بروئے کار نہیں آسکتا۔" مسلم ہند کے مسائل حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ملک کی از سر نو تقسیم کی جائے اور قطعی اکثریت کے ساتھ

ایک یا زائد اسلامی مملکتیں قائم کی جائیں۔"

مئی ۱۹۳۷ء میں یہ خط لکھتے وقت خود علامہ اقبالؒ کی صحت جواب دے رہی تھی۔ لیکن ملک کی نازک صورت حال کے پیش نظر انہوں نے کچھ عرصے کے بعد پھر قائداعظم کو لکھا:

"اس وقت ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جس کی ذات سے قوم بجا طور پر یہ توقع کر سکتی ہے کہ شمال مغربی ہند بلکہ پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے جو طوفان آ رہا ہے اس میں آپ اس کی رہنمائی فرمائیں گے۔"

قائداعظم نے آنے والے سیاسی طوفان میں مسلمانوں کی جس طرح رہنمائی کی اس سے ثابت ہوا کہ اقبالؒ کا اعتماد غلط نہیں تھا۔ جولائی ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے سات صوبوں میں اپنی وزارتیں بنائیں۔ حکومت بنانے کا موقع ملتے ہی کانگریس نے پہلا کام تو یہ کیا کہ باقی چار صوبوں میں جہاں مسلم لیگی ممبروں کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں جہاں مسلم لیگ کو خاصی نشستیں مل گئی تھیں۔ اُمید کی جاتی تھی کہ لیگ کو کانگریس کے ساتھ مخلوط حکومت میں شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ خاص طور پر یوپی میں جہاں انتخابات سے پہلے لیگ اور کانگرس میں مفاہمت ہوگئی تھی اور دونوں کے امیدواروں نے انتخابات ایک ٹکٹ پر لڑے تھے لیکن کانگرس نے مفاہمت کا لحاظ نہیں کیا۔ اور حکومت میں شامل کرنے کے لیے مسلم لیگ کے سامنے ایسی شرائط

رکھیں جو اس کی سیاسی موت کے مترادف تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ
کو سیاسی قوت کے طور پر بالکل ختم کر دیا جائے۔ کانگریس کے اس رویّے
اور بدعہدی نے قائداعظم کو آخر کار حتمی طور پر قائل کر دیا کہ ہندو کانگریس سے
کوئی توقع رکھنا بیکار ہے۔ ہزار بار کی مفاہمت کی کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں
نکلا تھا۔ اب اس کے بغیر چارہ نہیں رہا تھا کہ مسلمان اپنی سیاسی قوت سے
اپنے قومی وجُود کا تحفظ کریں۔

۱۹۳۷ء کا تاریخی خطبۂ صدارت:

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں قائداعظم نے
اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

" واقعات اور حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس سے
کسی انصاف کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ مَیں چاہتا ہوں مسلمان خود اپنے
اُوپر بھروسہ کریں اور اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں۔ ہمیں ایسے افراد
کی ضرورت ہے جو حوصلہ مند اور پختہ عزم کے مالک ہوں جو اپنے
اصولوں کے لیے جدوجہد کر سکیں۔ خواہ پُوری دُنیا ہمارے خلاف کیوں نہ ہو
ہمیں قوت اور اتحاد درکار ہے اور یہ قوت عوام کے تعاون اور اتحاد کے
ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے"۔

انہوں نے اپنا خطبۂ صدارت ان الفاظ پر ختم کیا:۔

"میں ہر مرد، عورت اور بچے سے اپیل کرتا ہوں کہ مشترکہ پلیٹ فارم
پر یہ آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ جس قدر جلد ہو سکے۔

اپنے آپ کو منظم کر لیجئے۔اور پوری طرح متحد رہیے۔ تربیت یافتہ اور منظم
سپاہیوں کی طرح ہر وقت چوکس رہیے۔ اپنے حلقوں میں سپاہیانہ سپرٹ اور
مل جل کر کام کرنے کا جذبہ پیدا کیجئے اپنے ملک اور اپنے عوام کی تندہی اور
فرض شناسی کے جذبے کے ساتھ خدمت کیجئے۔ محنت، جفاکشی اور قربانیوں
کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لوگ آپ کو ڈرائیں گے، بہلائیں گے، پھسلائیں
گے، اور شاید آپ کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑے مگر یاد رکھیے کہ آگ میں
تپ کر ہی لوہا کندن بنتا ہے۔ ظلم وستم دھمکی، ترغیب، تحریص کے جال
میں نہ پھنسیئے۔ اپنے ارادے پر جمے رہیے۔ یقین کیجئے رنج و آلام اور آزمائش
کے اس دور کے بعد ایک ایسی قوم نمودار ہو گی جو اپنی گذشتہ عظمت اور
تاریخ کے شایان شان ہو گی اور اس عظمت میں چار چاند لگانے کے
لیے زندہ رہے گی۔

ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو ہراساں ہونے کی ضرورت
نہیں ہے۔ ان کا مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے وہ منظم اور متحد ہو کر
ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نصب العین کا دفاع کرنے کی طاقت
رکھتے ہیں۔"

قائداعظم کا یہ خطبہ مسلم لیگ کے آئندہ لائحہ عمل کا خاکہ تھا۔ گاندھی نے
قائداعظم کو لکھا "جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ کی پوری تقریر اعلانِ جنگ
ہے"۔ گاندھی کا یہ سمجھنا کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ قائداعظم فیصلہ کر چکے تھے کہ اب
جدوجہد کا رُخ کیا ہو گا۔

پیرپور رپورٹ

سات صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے چند مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ مسلم لیگ کو ہندوؤں اور کانگریسیوں کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کی شکایتیں بڑے پیمانے پر ملنے لگیں۔ خاص طور پر سی۔پی، بہار اور یو۔پی میں نہ صرف مسلمانوں پر ظلم ڈھائے جا رہے تھے بلکہ ان کی تہذیب کو ہندوانہ رنگ دینے کی تدبیریں کی جا رہی تھیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ان شکایات پر غور کیا اور ان کی تحقیق کے لیے ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء کو راجہ صاحب پیرپور کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کر دی اس کمیٹی نے کانگریسی اکثریت کے صوبوں کا دورہ کیا اور ۱۵ نومبر ۱۹۳۸ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی اس پیرپور رپورٹ نے بیشتر شکایات کو صحیح بتایا اور تصدیق کی کہ مسلمان بچوں کو بندے ماترم پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہے جس سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ بیشتر مقامات پر جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری ہندوؤں پر عائد ہوتی ہے رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کانگریسی وزارتیں اردو کو مٹانے کے درپے ہیں۔

تیسری پارٹی

پیرپور رپورٹ کے بعد ایک بار پھر لیگ اور کانگریس میں مذاکرات ہوئے

لیکن کانگریس نے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت ماننے سے انکار کرکے مفاہمت کا آخری موقع گنوا دیا۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں" کانگریس اور حکومت برطانیہ"۔

قائداعظم نے فوراً للکارا۔

"یہ غلط ہے، ہندوستان میں ایک تیسری پارٹی بھی موجود ہے۔ یعنی مسلمان' ہم کسی کے محکوم نہیں رہیں گے"۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کو بنگال اور پنجاب کے وزراء اعلیٰ کا تعاون حاصل ہو گیا سندھ میں بھی مسلم لیگ کا اثر بڑھنے لگا تھا۔ یہ صرف قائداعظم کی مؤثر قیادت کا کرشمہ تھا کہ مسلم لیگ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ماسوائے سرحد ایک قوت کی حیثیت سے اُبھر رہی تھی۔

۲۲ ر اکتوبر ۱۹۳۹ء کو کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا تو ۲۲ ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو مسلم لیگ نے پُرامن طریقے سے یوم نجات منایا۔ اس سے پہلے ۷ ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو قائداعظم کی صدارت میں سندھ مسلم لیگ ایک قرارداد منظور کر چکی تھی کہ برصغیر کی دو قوموں کی متوازی آزادی اور ترقی کے لیے کوئی نیا آئینی حل تلاش کیا جائے۔ اسی قرارداد کی روشنی میں مسلم لیگ کونسل نے ایک آئینی کمیٹی ۱۹۳۹ء کے اواخر میں قائم کی۔

قرارداد پاکستان | اسی دستور کمیٹی کی سفارشات ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس میں اس مشہور تاریخی قرارداد کی شکل میں پیش کی گئیں

جو اَب قرار دادِ لاہور اور قرار دادِ پاکستان کے نام سے معروف ہے۔ اس قرارداد میں کھل کر دو قومی نظریے کی بنیاد پر برصغیر کو بعض رہنما اصولوں کے تحت دو آزاد مملکتوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی متفقہ آواز تھی اور اس کو سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے قائداعظم کی حمایت حاصل تھی۔ سارے مسلم راہنماؤں اور ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو کانگریسی وزارتوں کے تجربے سے یقین ہو گیا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں وفاقی آئین کے تحت مسلمان ہمیشہ ہمیشہ ہندو اکثریت کے محکوم رہیں گے اور رفتہ رفتہ ان کی قومی انفرادیت ختم ہو جائے گی۔ اس لیے اس کا وہی واحد آئینی حل تھا جو ۱۹۳۰ء میں اقبالؒ نے اور ۱۹۳۲ء میں چودھری رحمت علی نے پیش کیا تھا۔ یعنی دو قومی نظریے کی بنیاد پر بعض رہنما اصولوں کے تحت برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کی تخلیق۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کا مسوّدہ تیار کرنے میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان بھی شریک تھے۔ قرارداد کو قائداعظم نے آخری شکل دی۔ اس کو بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق نے اجلاس میں پیش کیا۔ یو پی کے چودھری خلیق الزماں نے تائید کی اس کے بعد ہندوستان کو دوسرے حصوں کے رہنماؤں نے تائید میں تقریریں کیں۔

قراردادِ پاکستان پر قائداعظم کی تقریر

قائداعظم نے اپنی زندگی کی بہترین تقریر اس موقع پر کی، آپ نے فرمایا:-

"مسلمان اقلیت نہیں ہیں، مسلمان صحیح معنوں میں ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم اس ملک کے بڑے علاقے میں آباد ہیں جہاں ہم اکثریت میں ہیں مثلاً بنگال، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان۔ ہندوستان کے مسئلے کی نوعیت فرقہ وارانہ نہیں بلکہ دو قومی ہے۔ ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا صرف یہی حل ہے کہ برصغیر کو خود مختار قومی ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔"

اس طویل قرارداد کے اہم نکات صرف دو تھے:

۱۔ مسلم اکثریت کے علاقوں میں دو آزاد ریاستیں قائم کی جائیں۔

۲۔ مسلم اکثریت کے ان علاقوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو مناسب تحفظات دیئے جائیں۔

اسی طرح ہندوستان میں مسلم اقلیت کے مفادات کا ضروری تحفظ کیا جائے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اس قرارداد کا منظور ہونا تھا کہ کانگریس اور ہندو انڈیا نے شدید ترین رد عمل کا اظہار کیا۔ سارا ہندو پریس اس قرارداد، مسلم لیگ اور قائداعظم کے خلاف حرکت میں آگیا۔ ہندو نفرت اور حقارت سے کہتے کہ اس قرارداد میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کا وجود میں لانا ناممکن ہے۔ اگرچہ قرارداد میں پاکستان کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن قرارداد پاکستان سے بڑھ کر اس کا موزوں نام کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ قائداعظم اور مسلم لیگ نے اقبالؒ کے دیتے ہوئے اس نصب العین کو چوہدری رحمت کے وضع کیے ہوتے لفظ پاکستان سے موسوم کرنا شروع کر دیا۔ اس نام بن

کچھ ایسی تاثیر تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں پاکستان کا لفظ ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔ صدیوں سے مسلمانوں کو جس منزل کی تلاش تھی وہ اب ان کے سامنے تھی۔

قرارداد پاکستان کی منظوری کے زمانے میں برطانوی حکومت دوسری جنگ عظیم کے بدترین دور سے گذر رہی تھی اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح ہندوستان کا تعاون جنگی کوششوں میں حاصل کیا جائے۔ اُدھر کانگریس اس صورتِ حال سے پورا سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے انگریزوں پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ اس عرصے میں کانگریس اور لیگ میں پھر مذاکرات ہوئے۔ لیکن کانگریس، لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرنے کو اب بھی تیار نہ تھی۔ مسلم لیگ مشروط طور پر حکومت سے تعاون کرنے پر تیار تھی۔ جب سر سکندر اور مولوی فضل الحق نے مسلم لیگ کی ہدایات کے خلاف وائسرائے کی جنگی کونسل کی رکنیت قبول کی، تو لیگ نے دونوں کے خلاف تادیبی کارروائی کی۔ اس عرصے میں کانگریس نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک شروع کی۔ اور بہت سے تشدد کے واقعات بھی رونما ہوئے۔ تحریک تو بڑی حد تک ناکام ہوگئی لیکن مشرق بعید میں جنگ کی صورت حال بگڑنے اور برما تک جاپانیوں کی یلغار نے برطانوی حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے آئینی مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کرے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۲ء میں مسٹر اسٹیفورڈ کرپس نئی آئینی اصلاحات کا جائزہ لینے ہندوستان آئے اور اہم لیڈروں سے صلاح مشورہ کیا۔ کرپس نے جو تجاویز پیش کی تھیں ان

میں تقسیم کے اصول کو قبول کرنے کا اشارہ تو موجود تھا لیکن اس سے مسلم لیگ مطمئن نہیں تھی ادھر کانگریس یک قومی نظریے کے تحت ہندوستان کو متحد رکھنے پر مصر تھی۔ نتیجتہً کرپس تجاویز پورے طور پر کسی نے قبول نہیں کیں اور یہ مشن ناکام ہوگیا۔ سیاسی مذاکرات کے اس نازک دور میں قائداعظم مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کی پوزیشن مضبوط کرنے میں مصروف تھے۔ سندھ اسمبلی نے سب سے پہلے مطالبہ پاکستان کی حمایت میں قرارداد منظور کی۔ بنگال میں بھی مسلم لیگ ایک طاقت بن کر ابھر رہی تھی۔

قاتلانہ حملہ

۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے قائداعظم مالا بارہل پہ واقع اپنی کوٹھی کے دفتر میں کام کر رہے تھے کہ دوپہر کے وقت ایک اجنبی مکان میں داخل ہوا اور کہا کہ وہ قائداعظم سے ملنا چاہتا ہے بڑے دروازے کا پٹھان چوکیدار اجنبی کو لے کر قائداعظم کے سیکرٹری مطلوب الحسن سید کے پاس آیا۔ اجنبی نے سیکرٹری سے بھی یہی کہا کہ میں قائداعظم سے ملنا چاہتا ہوں. سیکرٹری نے اُسے بہت سمجھایا کہ قائداعظم پہلے وقت مقرر کر کے لوگوں سے ملتے ہیں اور یہ کہ اگر آپ اپنی آمد کا مقصد تحریر کر دیں تو میں تاریخ اور وقت مقرر کرنے کی کوشش کروں گا اور آپ کو مطلع کر دوں گا۔ اتنے میں قائداعظم کسی فائل کی تلاش میں اپنے سیکرٹری کے کمرے میں داخل ہوتے قائداعظم کو دیکھتے ہی وہ شخص چیخ چیخ کر ان سے کہنے لگا کہ مجھے چند منٹ دے دیجئے۔ قائداعظم

نے انتہائی نرم لہجے میں جواب دیا "میں آج بہت مصروف ہوں میرے سیکرٹری آپ کو وقت دے دیں گے۔ اس پر اس نے جیب سے لمبا چاقو نکال لیا اور قائداعظم پر حملہ کرنے کے لیے جھپٹا۔ قائداعظم نے حملے کو روکنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ خوش قسمتی سے اس کا نشانہ چوک گیا۔

قائداعظم کے سیکرٹری اور چوکیدار نے اگرچہ حملہ آور پر قابو پا لیا تاہم قائداعظم کے چہرے اور گردن پر زخم آئے۔ حملہ آور کا نام رفیق صابر تھا وہ لاہور سے بمبئی آیا تھا اس کا تعلق خاکسار تحریک سے تھا۔

مسلم لیگ کا عروج

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو مسلم اکثریتی صوبوں میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ قرارداد پاکستان منظور ہونے کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔ ۱۹۴۳ء تک سندھ، بنگال، آسام میں مسلم لیگ کے زیر اثر حکومتیں قائم ہو گئیں۔ سرحد اور پنجاب میں بھی مسلم لیگ کے اثر و رسوخ میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہوا کہ قائداعظم کی دور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اکثریتی صوبوں کی بھرپور حمایت کے بغیر پاکستان کا مطالبہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس حکمت عملی کے تحت قائداعظم نے اپنی توجہ ان صوبوں پر مرکوز کی اور انہیں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔

فروری ۱۹۴۴ء میں نئے وائسرائے لارڈ ویول نے مرکزی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا "آپ جغرافیے کو نہیں بدل سکتے۔ ہندوستان

ایک قدرتی وحدت ہے۔" قائداعظم کا تبصرہ" لارڈ ویول کانگریس سے ساز باز کر رہے ہیں"۔ ۱۴ر جون ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول نے ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا کوئی حل ڈھونڈنے کے لیے ممتاز لیڈروں کی کانفرنس شملہ میں طلب کی یہ کانفرنس بھی ناکام ہوگئی کانگریس اَب بھی مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اصل میں دو قومی نظریئے اور پاکستان کے مطالبے کی تردید کرنا چاہتی تھی بدقسمتی سے بعض کانگریسی مسلمان بھی ہندوؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔

اس صورتِ حال کا واحد حل یہی تھا کہ انتخاب لڑ کر دیکھ لیا جائے کہ کون کس کے ساتھ ہے۔ دسمبر ۱۹۴۵ء کی آخری تاریخوں میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے مسلم لیگ نے مطالبہ پاکستان کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کی تقریباً تمام نشستیں جیت لیں۔ مسلمانوں کے انتخابی حلقوں سے مسلم لیگ کو ۸۰ فیصد ووٹ ملے۔ قائداعظم نے اعلان کیا کہ خُدا نے مسلمانوں کو جو کامیابی عطا کی ہے اس پر اظہار شکر گذاری کے طور پر مسلمان ۱۱۔جنوری ۱۹۴۶ء کو یوم فتح منائیں اور مسجدوں میں سجدۂ شکر ادا کریں۔

۲۵۔ دسمبر ۱۹۴۵ء کو قائداعظم نے بمبئی میں اپنی سترّویں سالگرہ منائی۔ اس موقعہ پر میمن تاجروں کے ایوانِ تجارت نے انہیں چائے پر مدعو کیا۔ سپاسنامے کے جواب میں انہوں نے جو تقریر کی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سترّ سال کی عمر ہونے کے باوجُود ان میں جوانوں کا سا عزم اور جذبہ موجُود ہے۔ انہوں نے اپنی گرجدار آواز میں کہا:

"اگر ہماری جدوجہد آزادی میں ہندو ہمارا ساتھ نہیں دیتے تو مسلمان اور مسلم لیگ تنہا ہی پاکستان اور آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کریں گے۔"

قائداعظم کی رہنمائی میں مسلم لیگ کی مقبولیت اصل میں نظریۂ پاکستان کی مقبولیت تھی۔

فیصلہ کن انتخابات

اوائل ۱۹۴۶ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہونا تھے۔ کانگرس نے اپنے سارے وسائل مسلم لیگ کو شکست دینے کے لیے داؤں پر لگا دیئے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ مسلم لیگ اور مسلمانوں کے پاس وسائل کم لیکن حوصلہ اور جوش و ولولہ بہت زیادہ تھا۔ علی گڑھ اور لاہور کے مسلمان طالب علم مسلم لیگ کا پرچم لے کر گاؤں گاؤں، قریہ قریہ گھومنے لگے ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے ایک ہی آواز آتی تھی "پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ"۔ انتخابات کی اس مہم میں مسلم اقلیتی صوبوں میں جوش و خروش اکثریتی صوبوں سے بھی زیادہ تھا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ پاکستان کس علاقے میں بنے گا، مسئلہ یہ تھا کہ مسلم قوم کو ایک وطن ملے گا۔ اسلام کے نام پر ایک آزاد ریاست قائم ہوگی۔

عام انتخابات میں مسلم لیگ کو بحیثیت مجموعی زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ انتخابات کے نتیجوں سے ثابت ہو گیا تھا کہ مسلمانانِ ہند کی غالب اکثریت مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔ سندھ اور بنگال میں مسلم لیگ کو وزارت بنانے کا موقع بھی ملا۔ پنجاب میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی ۸۶ نشستوں میں سے

۷۹ء حاصل کی تھیں۔

برطانیہ کی لیبر حکومت ہندوستان کو جلد سے جلد حکومت خود اختیاری دینے پر آمادہ تھی۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے اعلیٰ اختیارات کا ایک وفد مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان بھیجا۔ اس وفد نے جو کیبنیٹ مشن کے نام سے مشہور ہے ہندوستان کے سب اہم لیڈروں سے بات چیت کی۔ مشن نے اعلان کیا:

مشن یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ہندوستان میں اقتدار کس طرح اور کیسے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت اہل ہند کو سونپ دی جائے۔ مشن نے وضاحت کی کہ اگر اختیارات کی منتقلی کے سوال پر مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہو سکی تو مجبوراً حکومت برطانیہ خود کوئی فیصلہ کرے گی۔

کیبنیٹ مشن کے رویے سے ظاہر تھا کہ ہندوستان کی آزادی کی منزل بالکل قریب ہے لیکن حکومت کیسے منتقل کی جائے گی یہ طے ہونا باقی تھا۔ کانگریس اور دوسرے ہندوؤں کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ ہندوستان متحد رہے اور اس کی ایک آئین ساز اسمبلی ہو کیبنیٹ مشن پر ہر طرف سے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ بڑا نازک وقت تھا برطانوی حکومت کا رجحان خود بھی متحدہ ہندوستان ہی کی طرف تھا۔ قائداعظم نے نہایت دوربینی اور فراست سے کام لیتے ہوئے ٹھیک اسی وقت مسلم لیگ کی طاقت کا مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا۔ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں ہندوستان بھر کے منتخب مسلمان ممبروں

کا کنونشن بلایا۔ اس کنونشن میں پہلے تو قرارداد لاہور میں جو دو آزاد ریاستوں
کا لفظ تھا اسے لفظ ریاست سے بدلا گیا۔ تاکہ ایک ملک پاکستان کے بارے میں
کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ دوسرے صاف اعلان کیا گیا کہ ہندوستان اور پاکستان
کے لیے دو علیحدہ علیحدہ آئین ساز اسمبلیاں بنائی جائیں اس اجتماع میں شریک
تمام نمائندوں نے ایک عہد نامے پر دستخط کیے جس میں کہا گیا تھا کہ ان
کا ایمان ہے کہ پاکستان اور صرف پاکستان ہی مسلمانان ہند کی نجات کا راستہ
ہے اور حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے
مشن نے مفاہمت کے لیے کئی تجویزیں پیش کیں۔ لیکن قائداعظم جناحؒ
مطالبہ پاکستان سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے ۔ آخر کار
مختلف مذاکرات کے ناکام ہونے کے بعد کیبنیٹ مشن نے خود ایک
منصوبہ پیش کیا جس میں پاکستان کا اصول اور بنیاد موجود تھی۔ ملک کو تین
منطقوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر حصے کو کچھ عرصے کے بعد وفاق سے
علیحدگی کا حق دیا گیا تھا۔

کیبنیٹ مشن کے پلان میں ایک عبوری حکومت کی تجویز بھی تھی۔
کچھ جرح اور کچھ شرطوں کے ساتھ مسلم لیگ اور کانگریس نے کیبنیٹ مشن
پلان کو قبول بھی کر لیا۔ لیکن کانگریس کا دل صاف نہیں تھا۔ ۱۰ جولائی
۱۹۴۶ء کو پنڈت نہرو نے کیبنیٹ مشن پلان کے تحت مجوزہ دستور ساز اسمبلی
کے اختیارات کی اس طرح توجیہہ کی کہ قائداعظم کو شبہ ہو گیا کہ کانگریسی مشن
پلان سے اپنا مطلب نکالنا چاہتی ہے اُدھر برطانوی پارلیمنٹ میں مشن سربراہ

نے انکشاف کیا کہ حکومت مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی مکمل تائید نہیں کرتی۔ اب مسلم لیگ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ مشن کے پلان کی منظوری سے دستکش ہو جاتے۔ قائداعظم اور مسلم لیگ کو بد دیانتی اور بدنیتی دونوں سے نمٹنا تھا۔ مسلم لیگ نے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگیوں نے برطانوی حکومت کے خطابات واپس کر دیے۔ ۱۶۔ اگست ۱۹۴۶ء کو سارے ملک میں یوم راست اقدام منایا گیا۔ پاکستان کے قیام کی ضرورت اور مسلم لیگ کی منظور کردہ قرارداد کی وضاحت کی گئی۔ کیبنٹ مشن پلان کے تحت ۲۔ ستمبر کو کانگریس نے عبوری حکومت میں شرکت کی۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں وائسرائے کی بعض یقین دہانیوں کے بعد قائداعظم نے بھی مسلم لیگ کے پانچ نمائندوں کو عبوری حکومت کے لیے نامزد کر دیا۔ جن میں ایک لیاقت علی خاں بھی تھے مقصد یہ تھا کہ عبوری حکومت میں کانگریس من مانی نہ کر سکے اور مسلم لیگ کی سیاسی قوت کا عملی مظاہرہ ہو۔ اس مشکل زمانے میں قائداعظم کی سیاسی فراست اور تدبر پر آغا خان نے یوں تبصرہ کیا ہے:

"قائداعظم کی تابناک اور عہد آفریں شخصیت ۴۶ اور ۴۷ کے اہم سالوں میں اپنے عروج پر تھی"۔

منزل سے قریب تر

چونکہ کانگریس نے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کے کیبنٹ مشن پلان کو مشروط طریقے

سے قبول کیا تھا۔ اس لیے مسلم لیگ نے دستور ساز اسمبلی کے دسمبر ۱۹۴۶ء کے اجلاس کا بائیکاٹ کیا۔ ملک میں فرقہ وارانہ صورت حال بد سے بد تر ہوتی جا رہی تھی۔ برطانوی کابینہ کا منصوبہ بھی ناکام ہو چکا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر حکومت برطانیہ نے اقتدار اور اختیارات کی حتمی تاریخ جون ۱۹۴۸ء مقرر کر دی تاکہ مجبوراً دونوں جماعتیں مفاہمت کی کوئی صورت نکالیں۔

تقسیم ہند کا منصوبہ

۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے عہدے کا چارج لیتے ہی اقتدار منتقل کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے ایک وفاقی دستور کے تصور کو ترک کر کے ایک متبادل منصوبہ تیار کیا۔ جس کے تحت صوبوں یا صوبوں کے فیڈریشن کے اختیارات منتقل کرنے تھے بشرطیکہ صوبے کوئی فیڈریشن بنا سکیں۔ تاہم پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں کے دو حصے کیے گئے تھے یعنی مسلم حصہ اور غیر مسلم حصہ اور اگر دونوں حصوں نے یہ طے کیا کہ ان صوبوں کی تقسیم ہونی چاہیئے تو اسے صوبے کی خواہش کے طور پر قبول کر لیا جائے گا۔ اگر بنگال کی تقسیم کی گئی تو آسام میں مسلم اکثریت کے ضلع سلہٹ کو پاکستان کے ساتھ شمولیت کا حق دیا جائے گا۔ بشرطیکہ سلہٹ اس ضمن میں یہ فیصلہ کرے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے وہاں رائے شماری کرائی جائے گی۔ اس تجویز پر کچھ دنوں بحث و تکرار ہوتی رہی اب برطانوی حکومت ہر قیمت پر جلد

سے جلد اقتدار منتقل کرنا چاہتی تھی۔ آخر کار ۲ جون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے نے نئی دہلی میں لیگ اور کانگریس کے نمائندوں اور سکھوں کے ایک نمائندے کو حتمی مذاکرات کے ایک اجلاس میں طلب کیا۔ اس نے جو منصوبہ پیش کیا وہ یہ تھا۔

۱۔ تقسیم کا اصول قبول کر لیا گیا ہے

۲۔ تقسیم کی صورت میں دونوں مملکتیں آزاد ہوں گی۔

۳۔ انہیں مکمل ڈومینین کا درجہ دیا جائے گا اور انہیں دولت مشترکہ سے علیحدگی کا حق ہو گا۔

۴۔ بنگال، پنجاب اور ریاستوں کے متعلق کیبنٹ مشن پلان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

اسمبلیوں میں مسلم اکثریت کے ضلعوں کے نمائندے خود یہ فیصلہ کریں گے کہ آیا موجودہ دستور ساز اسمبلی آئین بنائے یا اس مقصد کے لیے نئی دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کی جائے۔ ان اسمبلیوں کے مسلم اور غیر مسلم ممبروں کے علیحدہ اجلاس ہوں گے اور یہ طے کیا جائے گا کہ آیا صوبے کو تقسیم کیا جائے یا نہیں۔ سندھ اسمبلی بھی اس پر سوال پر خود فیصلہ کرے گی۔ سرحد میں بھی رائے شماری ہو گی اور برطانوی بلوچستان کے لیے گورنر جنرل تجاویز مرتب کریں گے۔ اس تقسیم کا فیصلہ ہوا تو آسام کے ضلع سلہٹ میں رائے شماری ہو گی۔ اگر اس طریق کار کے مطابق یہ طے ہوا کہ ہندوستان کی تقسیم ہونی چاہیے اور بنگال و پنجاب کو بھی تقسیم کیا جائے تو اس مقصد کے لیے سرحدوں کی

حد بندی کی غرض سے ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ اقتدار کی منتقلی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک مکمل ہو جائے گی۔

اس اسکیم کو ان حالات میں بہترین اور ممکن حل سمجھ کر قائداعظم نے بھی قبول کر لیا جو خیال اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں ایک آرزو کے طور پر پیش کیا تھا وہ تصور قائداعظم کی بے مثال قیادت میں ایک حقیقت کے طور پر پاکستان کی شکل میں سامنے آگیا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کی رات کو پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس منصوبے کی تفصیلات کا اعلان کیا جس میں سب سے اہم نکتہ دو خود مختار مملکتوں کو برطانوی اقتدار منتقل کرنے کا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے بعد پنڈت نہرو نے کانگریس کی طرف سے تقریر کی۔ نہرو کے بعد قائداعظم نے مسلمان قوم سے خطاب کیا اس موقع پر ان کی آواز خلوص اور عاجزی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس نازک مرحلے پر وہ ہماری رہنمائی کرے اور ہمیں دانشمندی اور تدبّر کے ساتھ ذمہ داری سنبھالنے کی توفیق فرمائے"

منصوبہ کا تذکرہ کرتے ہوتے قائداعظم نے فرمایا۔

"بعض پہلوؤں پر یہ منصوبہ مسلم لیگ کے موقف پر پورا نہیں اترتا۔"

اس موقع پر انہوں نے پاکستان کی خاطر قربانیاں دینے والوں کو بھی یاد رکھا۔ قائداعظم نے اپنی یادگار تقریر ان دو الفاظ پر ختم کی جو تقریر کے مسودہ میں شامل نہیں تھے۔

یعنی "پاکستان زندہ باد"

پاکستان زندہ باد سن کر کروڑوں مسلمانوں کے سر سجدہ شکر بجا لانے کے لیے جُھک گئے۔

آزادی کی تاریخ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء مقرر ہوئی جون ۱۹۴۷ء کے آخر میں قائدِاعظم نے پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ ملک کے حالات اور ماؤنٹ بیٹن کے رویے کے پیشِ نظر یہ بہت صحیح فیصلہ تھا

قاتلانہ حملے کی سازش

۷ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے عملے کے ساتھ کراچی روانہ ہونے سے دو روز پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائدِاعظم کو ایک نجی ملاقات میں بتایا کہ محکمہ سراغ رسانی کی اطلاعات کے مطابق ان کو قتل کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ ان منصوبوں میں سکھ لیڈروں کا ہاتھ بتایا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک منصوبہ یہ تھا کہ جب قائدِاعظم ۱۴ اگست کو کراچی میں آزادی کی تقریبات میں شرکت کرنے تشریف لائیں تو ان پر قاتلانہ کیا جائے۔ یہ سب کچھ سُننے کے باوجُود قائدِاعظم کے اطمینان اور سکون میں فرق نہ آیا اور فرمایا۔ یومِ آزادی کا جلوس پروگرام کے مطابق نکلے گا۔ کیونکہ یہ تقریب سب سے اہم اور مبارک ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء بروز جمعرات ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ قائدِاعظم کھلی بگھی میں گورنر جنرل ہاؤس روانہ ہُوئے۔ جہاں اقتدار کی منتقلی کی رسُومات ادا ہُوئیں۔ راستہ میں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ جب بگھی گورنر جنرل ہاؤس میں داخل ہوئی تو قائدِاعظم نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا خُدا کا شکر ہے کہ آپ میرے ساتھ زندہ سلامت واپس آ گئے۔

بحیثیت سربراہِ مملکت

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو گزٹ آف پاکستان کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ اس میں قائداعظم کے گورنر جنرل کی حیثیت سے اختیارات سنبھالنے کا باضابطہ اعلان درج تھا۔ اسی گزٹ میں ایک اور اطلاع یہ بھی تھی کہ "ہز ایکسیلینسی گورنر جنرل نے مسٹر لیاقت علی خان، مسٹر آئی آئی چندریگر، مسٹر غلام محمد، سردار عبدالرب نشتر، مسٹر غضنفر علی خان، مسٹر جوگندر ناتھ منڈل اور مسٹر فضل الرحمٰن کو وزیر مقرر کیا ہے"۔

پاکستان ایک غیر معمولی سیاسی بحران میں وجود میں آیا تھا۔ اور وجود میں آنے کی گھڑی ہی سے شدید تر مسائل اور مشکلات کے بھنور میں گھرا ہوا تھا۔ ایک عظیم مملکت کی انتظامیہ کو تقریباً مکمل بے سروسامانی کی حالت سے بروئے کار لانا ہی کچھ کم مسئلہ نہ تھا کہ ملک میں لاکھوں لٹے پٹے تباہ حال مہاجر آنے لگے۔ ریڈ کلف ایوارڈ کی صریح ناانصافی سب کے لیے ایک زبردست نفسیاتی صدمہ تھی جس نے کشمیر کا مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ ملک کے حصے کا فوجی سازو سامان اور روپیہ ابھی تک ہندوستان ہی میں تھا۔ ان حالات میں قائداعظم نے ملک کی سربراہی کے اختیارات سنبھالے۔ اس

وقت ان کی عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ قرار داد لاہور سے وہ مسلسل جنگ و دو میں مصروف تھے اور اب پاکستان بننے پر سنگین تر مسائل کا سامنا تھا۔ لیکن قائداعظم تو قائداعظم تھے۔ انھوں نے اس مرحلے میں قوم کو منظم کیا۔ حوصلوں کو بلند رکھا۔ سیاسی رہ نمائی کی اور مشکلات و مسائل سے عہد برآ ہونا سکھایا۔

قائداعظم کی نظر مملکت کے بڑے سے بڑے امور سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی جزئیات تک رہتی تھی۔ ان کے پرائیویٹ سکریٹری ایس ایم یوسف نے لکھا ہے "قائداعظم اصولی طور پر اس وقت تک کسی مسودہ قانون پر دستخط نہیں کرتے تھے۔ جب تک وہ اس کے ہر لفظ ہر سطر سے خود مطمئن نہ ہو جائیں۔ وہ انتظامیہ کو چوکس رکھتے تھے اور کسی کو اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ علالت اور خرابیِ صحت یا کوئی رکاوٹ انھیں اپنے فرائض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی تھی"۔ اگرچہ قائداعظم کی صحت اجازت نہیں دیتی تھی تاہم اُن کی خواہش تھی کہ مہاجر کیمپوں کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے خود لاہور جائیں۔ انھیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ اپنے فرض کی ادائیگی سے کوتاہی برتیں جو انھیں تمام چیزوں سے زیادہ عزیز تھا یا اپنی صحت کی فکر کریں۔ انھوں نے ڈاکٹروں کا مشورہ نظر انداز کر دیا اور فرض کو ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُنھوں نے فرد کی حیثیت سے اپنے تمام حقوق قوم کے سپرد کر دیئے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں وہ کراچی سے لاہور روانہ ہوئے۔ ڈاکٹروں نے

صرف چند لوگوں سے ملنے اور روزانہ ایک گھنٹے سے زیادہ کام نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ لاہور میں حیدرآباد کے سلسلہ میں انہوں نے گھنٹوں گفتگو کی۔ کشمیر کے مسئلہ پر غور کیا۔ کیمپوں کو دیکھا۔ سیاسی گتھیاں سلجھائیں نتیجتاً انہیں حرارت ہوگئی۔ چند دن لاہور میں قیام کرنے کے بعد کراچی واپس آگئے۔
لیکن اہم سیاسی اور ملکی مسائل کو حل کرنے اکتوبر کے آخر میں دوبارہ لاہور تشریف لے گئے۔ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو انہوں نے یونیورسٹی اسٹیڈیم لاہور میں بہت بڑے اجتماع کے سامنے زبردست تقریر کی۔
اس تقریر میں پاکستان کو درپیش مسائل کا جائزہ لینے کے بعد کہا "اگر ہم قرآن پاک کو راہ نما بنائیں تو یقیناً فتح ہماری ہو گی"
قائداعظم جس وقت تقریر کر رہے تھے شدت جذبات سے ان کی زبان سے پورے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے کسی جلسۂ عام میں موت کا ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا:
"اپنا حوصلہ بلند رکھیئے۔ موت سے خوفزدہ نہ ہوں ہمارے مذہب نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم سفر آخرت کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔ ہمیں حوصلے اور جرأت کے ساتھ موت کا سامنا کرنا چاہیے۔ تاکہ پاکستان اور اسلام کے ناموس کی حفاظت کی جا سکے۔ مسلمان کے لیے شہادت سے بڑھ کر کوئی رتبہ نہیں۔ اپنا فرض انجام دیجئے اور خدا پر کامل اعتماد رکھیئے۔ دُنیا کی کوئی طاقت پاکستان کا وجود ختم نہیں کر سکتی۔ پاکستان ہمیشہ قائم رہیگا۔"
اس سفر سے انہیں بڑی تکلیف پہنچی۔ کچھ مہاجروں کی حالت زار

کا بھی ان پر اثر تھا۔ علالت عود کر آئی۔ اور انہیں پھر مجبوراً ڈاکٹروں
کے اصرار پر کچھ عرصے کے لیے تھوڑا آرام کرنا پڑا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں
وہ مشرقی پاکستان گئے وہاں انہوں نے صوبائیت کے زہر سے بچنے کی
تلقین کی اور کہا کہ پاکستان کی زبان اُردو ہوگی۔ اپریل ۴۸ء میں پشاور
گئے یہاں اُنہوں نے طلباء سے خطاب کیا۔ حصولِ پاکستان کے لیے انکی
خدمات کو سراہا۔ رسالپور میں انہوں نے ایر فورس کے افسروں اور جوانوں
سے خطاب کیا۔ ۱۴ اپریل گورنمنٹ ہاؤس میں سول افسروں سے طویل
گفتگو کی اور آخر میں ایک جلسہ عام میں تقریر کی اور بہادر پٹھانوں کا
شکریہ ادا کیا جنہوں نے بھاری اکثریت سے پاکستان کے حق میں فیصلہ
دیا تھا اس دورے میں قائداعظم ایک جلسۂ عام سے خطاب کر رہے
تھے کہ بادل چھا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بونداباندی ہونے لگی۔ بارش
تیز ہوگئی مگر حاضرین میں سے ایک شخص نے بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں
کی۔ خود قائداعظم بھی شرابور ہوگئے تھے۔ لیکن اپنی نشست سے نہ ہلے تھکان
اور کثرتِ کار کے سبب قائداعظم بھی علیل ہوگئے۔

زندگی کی شام

آخری علالت

بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں حالات بڑا بنا دیتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کی شخصیت ہی بڑی ہوتی ہے۔ وہ اپنی بڑائی کے لیے حالات کے محتاج نہیں ہوتے۔ وہ ہر حال میں بڑے رہتے ہیں۔ بلکہ نامساعد حالات میں ان کے جوہر زیادہ کھلتے ہیں۔ قائداعظم اسی قسم کے بڑے آدمی تھے۔ طویل اور مہلک علالت بڑے بڑوں کو معذور اور مجبور کر دیتی ہے۔ موت کے سائے بڑے بڑے دلاوروں اور حوصلہ مندوں کا پتہ پانی کر دیتے ہیں۔ لیکن قائداعظم وہ عظیم انسان تھے جنہیں نہ طویل مہلک بیماری زیر کر سکی نہ موت کے بڑھتے ہوئے سائے انہیں بے چین اور خوفزدہ کر سکے۔ ایک مصنف نے لکھا ہے کہ بعض بڑے آدمیوں کی زندگی میں بڑائی کا ایک دن آتا ہے اس دن کے ڈھلنے کے بعد انکی باقی زندگی اس بڑائی کی نفی میں گزرتی ہے۔ قائداعظم کی ساری زندگی بڑائی کا ایک طویل دن تھی اور ان کی موت بھی کچھ کم عظیم، کم پُر وقار اور کم موثر نہیں تھی۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ط ہر فانی جسم کو فنا ہے ان کا جسم مدتوں

طوفانوں اور آندھیوں کا مقابلہ کرنے کے بعد بالآخر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا تھا ان کی جسمانی قوتیں انجام کار جواب دینے لگی تھیں۔ لیکن انکی شخصیت کا جمال و جلال ان کے کردار کا وقار اسی طرح قائم رہا جس عظیم مقصد کے لیے وہ تمام زندگی جدوجہد کرتے رہے تھے جب وہ موت سے ہمکنار ہوئے تو وہی لفظ انکی زبان پر تھا۔ (بقول ڈاکٹر ریاض علی شاہ جوان کے انتقال کے وقت ان کے پاس موجود تھے " اللہ پاکستان" وہ دو آخری الفاظ تھے جو قائداعظم کے منہ سے نکلے۔ (قائداعظم کے آخری لمحات صفحہ ۹۷)

قائداعظم کی صلاحیتیں بھی غیر معمولی تھیں لیکن غیر معمولی تر انکی مسلسل محنت اور مشقت کی عادت تھی۔ بقول خود وہ مسلسل چودہ گھنٹے روز کام کرتے رہے۔ قرارداد پاکستان کے منظور ہونے کے بعد سے انکی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ لیکن وہ ضروری آرام کرنے پر یا کام کو کم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی سے کام کیے جا رہے تھے۔ لیکن جسم کو گھن لگ چکا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں پہلی بار پھیپھڑوں میں خرابی کا شبہ ہُوا لیکن حسبِ عادت انھوں نے بیماری پر توجہ نہ دی اور محض معمولی تکلیف سمجھ کر ٹال دیا۔ اہم سیاسی مذاکرات جاری تھے۔ شملہ کانفرنس، کیبنیٹ مشن کے مذاکرات، انتہائی اہمیت کے انتخابات، وہ ان انتہائی اہم معاملات میں اس طرح مصروف رہے کہ جسم کو آرام اور علاج کا وہ حصہ نہیں دے سکے جس کا

وہ مستحق تھا۔ ان ہی ہنگاموں میں پاکستان کی منزل قریب آ رہی تھی ایک نئی مملکت ان کے ہاتھوں جنم لے رہی تھی۔ اور خود انکی اپنی زندگی آخری مراحل میں داخل ہو رہی تھی شروع اگست میں کراچی پرواز کرنے سے پہلے انہیں ان سازشوں کا علم بھی ہو گیا تھا جو ان کی جان کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ لیکن خوف کھانا تو وہ جیسے جانتے ہی نہ تھے۔ ۱۴ راگست کو سربراہ مملکت کا منصب سنبھالتے ہی نئی مملکت کو انتہائی نامساعد حالات میں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کا بار بھی انہیں ہی اٹھانا تھا بھارت میں مسلمانوں کے قتل عام اور مہاجرین کی یلغار اور بربادی سے انہیں شدید جذباتی صدمے پہنچے۔ باؤنڈری کمیشن کی غداری اور کشمیر کی جنگ اور اس کے بعد کے اُلجھاؤ نے قائداعظم کی صحت کو شدت سے متاثر کیا۔ اب وہ ستر سال سے اُوپر کے ہو چکے تھے۔ توانائی کم ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن محنت ومشقت کے بار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹروں کے بار بار کے مشورے کے باوجُود وہ منصبی کاموں میں مصروف تھے اور قریبی دائرے کے لوگوں کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اندر سے ان کی صحت کس حد تک گر چکی ہے۔

مئی ۱۹۴۸ء میں انہیں پاکستان ملٹری اکیڈمی کے افتتاح کے لیے کاکول جانا تھا۔ افواج پاکستان کی تربیت و ترقی سے جو انہیں گہری دلچسپی تھی اس کے پیشِ نظر وہ وہاں جانے کے لیے مصر تھے لیکن طبیعت کے یکایک زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے وہ نہیں جا سکے۔ اور ڈاکٹروں کے پیہم

اصرار پر مجبور ہوکر وہ مئی ۱۹۴۸ء کے اواخر میں کوئٹہ تشریف لے گئے آرام اور علاج سے انہیں کچھ افاقہ بھی ہوا۔ لیکن ۳۰، جون ۱۹۴۸ء اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے لیے انہیں کراچی واپس آنا پڑا۔ انہوں نے پورے اہتمام سے تقریب میں حصہ لیا۔ اپنے مخصوص انداز اور لب ولہجے میں افتتاحی تقریر بھی کی لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سورج کو گہن لگنے کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ چٹان میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ لیکن ان کے جلال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کراچی کے مختصر قیام کے دوران انہوں نے بقول پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین نے اتنا کام کیا کہ کوئٹہ میں چند ہفتے آرام اور علاج سے جو صحت بحال ہوئی تھی۔ وہ زائل ہو گئی اور جب وہ واپس کوئٹہ پہنچے تو پہلے سے زیادہ علیل اور کمزور ہو چکے تھے۔ کوئٹے اور زیارت میں جو علاج ممکن تھا وہ ہو رہا تھا چونکہ وہ اپنی علالت کو ہمیشہ کی طرح زیادہ اہمیت نہیں دے رہے تھے ان کا خیال تھا کہ انہیں کچھ معدے کی تکلیف ہے کچھ کام کی زیادتی کی وجہ سے تھکن۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ جیساکہ بعد میں ماہر معالجوں نے ایکس رے اور دوسرے معائنوں سے تصدیق کی کہ تقریباً دو سال سے ان کے پھیپھڑے متاثر تھے جولائی ۱۹۴۸ء کے تیسرے ہفتے میں جب ان کی حالت بگڑنے لگی تو مس جناح نے سیکرٹری جنرل چوہدری محمد علی کے توسل سے مشہور ڈاکٹر کرنل الہٰی بخش کو زیارت طلب کیا چند روز بعد ڈاکٹر ریاض علی شاہ بھی بلا لیے گئے۔ جولائی کے چوتھے ہفتے سے قائداعظم کی وفات تک یہ دونوں قابل ڈاکٹر ان کے علاج

معالجے کے لیے حاضر رہے۔ انہوں نے قائداعظم کو پہلے بھی دیکھا تھا سنا بھی تھا.
اب شب و روز معالجوں کی حیثیت سے انہیں بستر علالت پر دیکھا۔ ان سے
باتیں کیں۔ طبی مشورے دیتے دوائیں تجویز کیں۔ پرہیز کرایا۔ تکلیف دہ انجکشن
لگائے۔ ان کی حالت کو بہتر ہوتے اور بگڑتے دیکھا۔ غرض چھ سات ہفتے وہ مس
جناح اور پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین کے ساتھ قائداعظم کی خلوت وجلوت
کے ساتھی رہے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد ڈاکٹر کرنل الہی بخش نے اپنے
مشاہدات قائداعظم کے آخری ایام کے نام سے لکھے۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ
نے اپنے تاثرات و قائداعظم کے آخری لمحات کے عنوان سے قلم بند کیے اور قائداعظم
کے سیکرٹری فرخ امین نے اپنے تجربات "حیات قائد کا آخری سال" کے عنوان سے شائع
کیے۔ ان تینوں تحریروں سے قائداعظم کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ کسی فرشتے یا
دیوتا کی تصویر نہیں ایک انسان کی تصویر ہے جو بیماری میں ضد بھی کرتا ہے
دوا سے بچتا بھی ہے۔ بد پرہیزی بھی کرتا ہے لیکن جو بیماری میں بھی عظیم
ہے جو بااصول ہے، باوقار ہے جو دلیل سے معالجوں کی ناگوار باتیں
قبول کر لیتا ہے جو باہمت، باحوصلہ ہے جو موت سے نہیں ڈرتا۔ جس
کی دیانت، وضع داری کوئی استثنائی صورت قبول کرنے پر تیار نہیں.
جو موت کو روبرو دیکھتے ہوئے بھی ہراساں نہیں ہوتا جو آخری دم تک
فرائض منصبی میں منہمک رہتا ہے جس کے شعور ہی میں نہیں لاشعور میں بھی ایک ہی دھن ہے، پاکستان

قائداعظم کی زندگی کی کوئی داستان مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ان
کی زندگی کے آخری ایام کا قدرے تفصیلی جائزہ بلکہ مطالعہ نہ پیش کیا جائے

اس لیے اور بھی کہ قائدِاعظم کے کردار اور شخصیت کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ انہیں اپنی زندگی کی آخری لڑائی لڑتے ہوئے نہ دیکھا جائے۔

ڈاکٹر کرنل الہی بخش جولائی ۱۹۴۸ء کے آخری ہفتے میں زیارت پہنچے۔ انہیں قائدِاعظم کی بگڑتی ہوئی حالت کے پیشِ نظر لاہور سے بلوایا گیا تھا شام کو ان کے آنے کی اطلاع قائدِاعظم کو کرائی گئی۔ لیکن قائدِاعظم نے ملاقات کا وقت دوسرے روز صبح مقرر کیا۔ ڈاکٹر الہی بخش کو حیرت تو ہوئی کہ بیماری کی اس حالت میں بھی یہ تکلف برتا جا رہا ہے لیکن اس میں حیرت کی بات نہیں تھی اس وقت تک بیماری قابو سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ اور قائدِاعظم کا خیال تھا کچھ معدے کی خرابی اور کچھ کام کی زیادتی سے وہ تھکن اور کمزوری کا شکار ہو گئے ہیں۔ دوسرے روز مقررہ وقت پر انہوں نے ایک اچھے مریض کی طرح کرنل الہی بخش کو اپنی گذشتہ تکلیفوں سے آگاہ کیا انہوں نے کہا "چند برس پہلے کبھی کبھی بخار اور کھانسی کی تکلیف ہو جایا کرتی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ پھیپھڑوں میں کچھ خرابی ہے تقریباً دو سال سے پھر یہ تکلیف عود کر آئی مجھے ڈاکٹروں سے اتفاق نہیں ۱۹۲۴ء میں بمبئی کے ڈاکٹروں نے مجھے دل کی تکلیف بتا دی تھی۔ ایک بار لندن کے ڈاکٹروں نے معدے کی تکلیف کے لیے آپریشن تجویز کر دیا تھا۔ دونوں بار جرمنی جا کر صحیح تشخیص ہوئی تھی کہ معدے کی کمزوری اور تھکان نے طبیعت کو مکدر کر دیا تھا۔ اب بھی میرا یہی خیال ہے کہ معدے میں کچھ خرابی ہے۔ میں

گذشتہ چالیس سال سے چودہ گھنٹے روزانہ کام کرتا رہا ہوں۔ کبھی کبھی کام کی زیادتی سے میں اعصابی تھکن کا شکار ہو ہی جایا کرتا ہوں"۔

ڈاکٹر الہی بخش نے پھر بھی تفصیلی معائنے کی اجازت چاہی۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ ماضی میں ڈاکٹروں کے متضاد مشوروں سے انہیں ڈاکٹروں پر اعتماد کم ہے۔ دواؤں سے بیزار ہیں خاص طور سے گولیاں کھانا پسند نہیں کرتے اور ٹیکوں سے بچتے ہیں ڈاکٹر کرنل الہی بخش لکھتے ہیں " معائنے کے بعد میں حیران ہوا کہ اتنے دُبلے اور ناتواں ہو کر وہ زندہ کیسے ہیں اور اتنا کام کیوں کر کر لیتے ہیں" تفصیلی معائنے کے بعد ان کی رائے یہ تھی کہ اصل تکلیف معدے کی نہیں پھیپھڑوں کی ہے جس کی تصدیق ایکس رے اور دوسرے لیبارٹری تجزیوں سے بھی ہوئی اب مسئلہ یہ تھا کہ قائداعظم کو اس سنگین صورت حال سے کیسے آگاہ کیا جائے تاکہ علاج میں ان کا تعاون حاصل ہو، ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی تھا کہ مرض کی اس نوعیت سے ان کے دل و دماغ پر ناگوار اثر نہ پڑے اور علاج مزید دشوار نہ ہو جائے ڈاکٹر الہی بخش یہ خبر قائداعظم کو سنانے سے ہچکچا رہے تھے۔ لیکن مس فاطمہ جناح اپنے عظیم بھائی کو زیادہ جانتی تھیں۔ انہوں نے کہا میرے بھائی کو اس چیز سے گھبراہٹ نہیں ہوگی۔ آپ ضرور بتایئے ان کے تعاون کے بغیر علاج ممکن نہیں (مس فاطمہ جناح قائداعظم کو میرا بھائی مائی برادر کہا کرتی تھیں، مس جناح کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ قائداعظم نے مرض کی اس سنگین نوعیت کے بارے میں یہ اطلاع بڑے سکون اور وقار سے سُنی۔

آخر میں اُنہا پُوچھا۔

فاطمہ کو تو نہیں بتایا۔

ڈاکٹر الٰہی بخش نے اعتراف کیا کہ وہ ضرورتاً بتا چکے ہیں طبی اخلاقیات کی رو سے اس صورت حال میں ان کے قریب ترین عزیزوں میں سے کسی کو اعتماد میں لینا ضروری تھا اور چونکہ مس فاطمہ جناح کے علاوہ کوئی اور موجُود نہ تھا اس لیے مجبوراً انہیں صورت حال سے آگاہ کرنا پڑا۔ یہ سن کر قائداعظم نے فرمایا:

" فاطمہ کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔ آخر وہ عورت ہی تو ہیں "۔

جری اور حقیقت پسند

قائداعظم نے زندگی بھر اپنے عظیم مقصد کی خاطر جرأت اور حقیقت پسندی سے جدوجہد کی تھی۔ اب جبکہ ان کی اپنی زندگی طوفان کی زد میں تھی۔ اس وقت بھی انہوں نے اپنی روایتی جرأت اور حقیقت پسندی سے کام لیا۔ ڈاکٹر الٰہی سے کہا پوری بات بتائیے۔ مرض کی پوری نوعیت سے آگاہ کیجئے۔ امکانات کیا ہیں علاج کی کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ مکمل صحت یابی میں کتنا عرصہ لگے گا" حسب عادت وہ اس مشکل صورت حال سے ہراساں ہونے کے بجائے اس سے ہوش اور حوصلے سے نپٹنے کی تیاریاں کرنے لگے ان کے اس ردِعمل سے ڈاکٹر کو حیرت بھی ہوئی اور اطمینان بھی چونکہ ان کے اس ذہنی رویے سے علاج کے زیادہ موثر ہونے کا امکان تھا۔

نرس کی ضرورت نہیں

ڈاکٹر الہی بخش نے علاج کو زیادہ منظم کرنے کے لیے ایک نرس کو مقرر کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ قائداعظم نے اتفاق نہیں کیا اصل میں وہ اپنے آپ کو اتنا بیمار نہیں سمجھتے تھے کہ ایک نرس کے محتاج ہوں محتاجی انہیں کسی صورت میں گوارا نہیں تھی یہ ان کے کردار کی ایک مستقل خصوصیت تھی جو ہر حال میں اور ہر دور میں باقی رہی۔

اصول پرستی کی قدر

نرس کے تقرر پر وہ راضی نہ ہوئے تھے لیکن ٹمپریچر وغیرہ لینے اور دوا پیش کرنے کی خدمت پر وہ ایک لیڈی کمپاونڈر مقرر کرنے پر راضی ہو گئے۔ ایک بار قائداعظم نے اس سے اپنا ٹمپریچر پوچھا اس فرض شناس لیڈی کمپاونڈر نے یہ کہہ کر معذرت کی میں ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر آپ کو ٹمپریچر نہیں بتا سکتی۔ اس کے با اصول انکار پر قائداعظم ناراض ہونے کے بجائے خوش ہوئے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ وہ خود با اصول اور ڈسپلن کے پابند انسان تھے اور جو باقاعدگی اور ڈسپلن سے کام کرے اس کی تعریف اور قدر کرتے تھے۔

ضرورت کے بغیر خرچ نہیں

زیارت کی بڑھتی ہوئی ٹھنڈک میں قائداعظم کے ریشمی شب خوابی کے

کپڑے ناکافی تھے ۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے گرم پاجامہ پہننے کا مشورہ دیا قائداعظم نے کہا میرے پاس گرم پاجامے نہیں ہیں کیوں نہ گاڑھے کے بنائے جائیں ۔ڈاکٹر نے کہا سوتی مناسب نہیں رہیں گے ۔ اس لیے میں نے خود ہی کراچی سے ۲۰ گز دائلا منگوانے کا اہتمام کیا ہے ۔ قائداعظم نے فرمایا :

" ڈاکٹر سنیے ! میری نصیحت یہ ہے کہ جب آپ کچھ خریدنا چاہیں تو دوبارہ غور کر لیا کریں کیا اس کے بغیر کام چل سکتا ہے یا واقعی اس کی ضرورت ہے۔"

قائداعظم کسی چیز کو بے جا صرف کرنے کے قائل نہ تھے ۔ خواہ وہ پیسہ ہو ، وقت ہو ، یا توانائی ۔ اسی احتیاط یا اعتدال کی وجہ سے وہ زندگی میں اتنے بڑے کام کر سکے ۔

جب کرنل الٰہی بخش نے اصرار کیا کہ واقعی گرم کپڑے کی ضرورت تھی تو مسکرا کر فرمایا " اچھا تو ٹھیک ہے۔"

ان کی افتاد طبع ہی ایسی تھی کہ وہ بے دلیل کوئی بات نہیں مانتے تھے ۔ دلیل سے وہ بات بھی قبول کر لیتے تھے جو انہیں طبعاً مرغوب نہ ہو یا جسے وہ عادتاً پسند نہ کرتے ہوں ۔ مثلاً نرس سے دیکھ بھال کرانا انہیں پسند نہ تھا۔ لیکن جب ڈاکٹر نے اس کی ضرورت پر زور دیا تو انہوں نے اُسے بھی قبول کر لیا۔

وضع داری کا پاس

۱۱ اگست ۱۹۴۷ء سے ان کی حالت پھر بگڑنے لگی تھی ۔ پاؤں پر ورم آگیا تھا اور گردے متاثر ہونے لگے تھے اس لیے انہیں زیارت سے کوئٹہ

لے جانا ضروری سمجھا گیا۔ ۱۴؍اگست کو روانگی تھی۔ ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے
ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ وہ کپڑے نہ بدلیں اور سفر کا کوئی اہتمام نہ کریں۔ لیکن
اتنی نقاہت کے باوجود انہوں نے شلوار اور شیروانی پہننے پر اصرار کیا۔ اور
پورے رسمی لباس میں سفر کیا حالانکہ اسٹریچر پر اُوپر سے نیچے لا کر موٹر میں
لٹائے گئے تھے۔ راستے میں ریسٹ ہاؤس میں انہیں چائے پینے کے لیے
ٹھہرنا تھا لیکن وہاں لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے سفر جاری رکھا۔ وہ نہیں
چاہتے تھے کہ لوگ اس حالت میں انہیں چائے پیتے دیکھیں اور یہ
بھی گوارا نہ تھا کہ محض اس لیے لوگوں کو وہاں سے ہٹوا دیں۔ کوئٹہ پہنچ
کر انہوں نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور کہا آپ لوگوں نے بہت اچھا کیا
مجھے یہاں لے آئے۔ زیارت میں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں پنجرے
میں بند ہوں۔

پسندیدہ ڈش

کوئٹہ آنے سے قائداعظم کو خاصا افاقہ ہُوا۔ بخار اتر گیا اور کچھ بھوک
بھی لگنے لگی۔ اخبارات اور ضروری کاغذات دیکھنے لگے۔ طبیعت کچھ بحال
ہوئی تو اپنی پسندیدہ ڈش حلوہ کی فرمائش کی۔ ڈاکٹر نے اجازت دی بشرطیکہ
حلوے کو ہلکا کر کے مکھن میں بنایا جائے۔

بد پرہیزی

لیکن وہ حلوے کو پوری کے ساتھ کھانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا

پوری بھاری ہوتی ہے اس لیے معدے پر بار پڑے گا۔ انہوں نے کہا میں خاص قسم کی پوری کھاتا ہوں۔ ڈاکٹر پھر بھی نہ مانے۔ دوسرے روز ڈاکٹر کو پتہ چلا کہ انہوں نے رات کو حلوے کے ساتھ ایک آدھ پوری بھی لی تھی۔ بہرحال حلوے پوری سے انہیں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اب ان کی حالت قدرے بہتر تھی۔ تجویز ہوئی بستر سے اٹھ کر دو چار قدم چلنا شروع کریں۔ ۲۴ اگست کو چہل قدمی کی کوشش کا وقت ۸ بجے مقرر ہوا تھا۔ ڈاکٹر الہی ذرا دیر سے پہنچے۔ قائداعظم نے باز پرس کی۔

"میں نے تو آپ کو آٹھ بجے آنے کے لیے کہا تھا میں اپنے معالجوں سے پابندی وقت کی توقع رکھتا ہوں" بعد کو فاطمہ جناح نے اس واقعہ پر کہا:

"میرے بھائی کی نظر میں پابندی وقت کی بڑی اہمیت ہے وہ خود اس اصول پر ہمیشہ سے کاربند رہے ہیں"

ڈاکٹر ان کی ظاہری بحالی سے غالباً ضرورت سے زیادہ پُر امید تھے۔ وہ ان کو چہل قدمی کرنے اور کراچی لے چلنے میں قدرے جلد بازی اور بے صبری سے کام لے رہے تھے۔ لیکن خود قائداعظم اپنے اندرونی احساس کی بناء پر اپنے آپ کو اس مشقت کے لیے آمادہ نہیں پاتے تھے۔

خوش مزاجی کا مظاہرہ

ڈاکٹر یوں باز نہ آئے تو انہوں نے مزاحیہ انداز سے سمجھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک بوڑھی عورت کی کہانی بیان کی جو صحت مند ہونے کے

بعد بھی اور ڈاکٹروں کے بار بار کہنے سے بھی بستر سے نہیں اٹھتی تھی۔ آخرکار ایک نئے ڈاکٹر نے جان بوجھ کر اس کے بستر کو آگ لگا دی آگ کو دیکھ کر وہ بستر سے اُٹھ کر بھاگی اور بھاگتی ہی چلی گئی۔ یہ کہانی سنانے کے بعد انہوں نے اپنے معالجوں کو مسکرا کر دیکھا اور کہا مجھے توقع ہے کہ آپ میرے ساتھ یہ سلوک نہیں کریں گے پھر شفقت سے سمجھانے لگے۔ بستر سے اُٹھنے، چلنے پھرنے کا خواہشمند میں بھی کچھ کم نہیں ہوں لیکن فی الحال میں اپنے میں وہ سکت نہیں پاتا۔

کل ۸۰ پونڈ وزن

کرنل الہی بخش نے لکھا ہے کہ صحت کی بحالی کے بعد بھی ان کا وزن ۸۰ پونڈ تھا۔ زیارت میں اس سے بھی کم ہو گا۔ قائداعظم نے انہیں بتایا بہت اچھی صحت کے زمانے میں بھی ان کا وزن تقریباً ۸ سٹون ۱۰۰ پونڈ سے زائد کبھی نہ ہوتا تھا۔

پسندیدہ سگریٹ

کریون اے ان کا پسندیدہ سگریٹ تھا جب انہیں سگریٹ پینے کی اجازت ملی تو انہوں نے کریون اے طلب کیا اس کی عدم موجودگی میں اسٹیٹ ایکسپریس ۵۵۵ بھی استعمال کیا لیکن جب کریون اے ملا تو ایک کے بجائے رات کو مزے سے چار پیئے پی۔ ڈاکٹر نے ایش ٹرے میں جب چار سگرٹوں کے ٹکڑے دیکھے تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

ان کے پسندیدہ کھانوں اور پسندیدہ سگرٹوں کی خواہش سے ڈاکٹر

خوش تھے کہ وہ اپنی صحت کی زندگی کی عادات کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں۔ لیکن قائداعظم تو ہر حالت میں قائداعظم رہتے تھے۔ کریون اے کے پسندیدہ سگرٹوں کا کرنل الٰہی بخش کا پیش کیا ہوا ڈبہ انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ سگریٹ پرانے ہو گئے ہیں۔ اصل میں وہ ڈاکٹر الٰہی کا احسان اٹھانا نہیں چاہتے تھے

بلا قیمت کوئی چیز نہیں

قائداعظم کا ایک ناقابل شکست اصول یہ تھا کہ وہ بلا قیمت کسی سے کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے کرنل الٰہی بخش کا پیش کیا ہوا پسندیدہ نایاب سگرٹوں کا ڈبہ انہوں نے اسی اصول کی وجہ سے واپس کیا۔ کرنل الٰہی بخش نے اپنی کتاب میں دو ایک ایسے واقعے اور بھی لکھے ہیں۔ شروع تاریخوں میں کوئٹہ کے جی او سی میجر جنرل محمد اکبر خان کی بیگم نے ڈاکٹر الٰہی بخش کے ہاتھ قائداعظم کے لیے کچھ اعلیٰ قسم کے انگور بھیجے۔ قائداعظم کو یہ انگور بہت پسند آتے اور بہت رغبت سے کھائے پوچھا ایسے اچھے انگور آپ کو کہاں مل گئے انہوں نے عرض کیا بیگم جنرل اکبر خان نے بھیجے ہیں ساتھ ہی یہ بھی کہا اگر آپ پسند فرمائیں تو وہ ہر روز اسی قسم کے انگور بھجوا سکتی ہیں۔ قائداعظم نے بیگم اکبر کا شکریہ ادا کیا اور مزید انگور قبول کرنے سے معذرت کی۔ ایک بار جنرل اکبر نے ڈاکٹر الٰہی بخش کے ہاتھ نادر سبز گلاب قائداعظم کو بھیجے اور کہا اگر قائداعظم کو یہ گلاب پسند آئے تو ہر روز یہاں سے تازہ سبز گلاب بھیجے جا سکتے ہیں۔ قائداعظم نے گلاب دیکھے بہت پسند کیے۔ شکریے کے

ساتھ سبز گلابوں کا یہ تحفہ بھی قبول کیا۔ لیکن فرمایا "میں جنرل کو پھول بھیجنے کی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔"

جلد کراچی واپس جانے سے گریز

اگست کے تیسرے ہفتے سے کوئٹے کی آب و ہوا بھی ان کے لیے شدید ثابت ہو رہی تھی۔ اور صحت کی بحالی ایک دم ابتری سے بدلنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا اب کراچی چلنا مناسب رہے گا۔ لیکن وہ کراچی جانے کو ٹالتے رہے۔ ادھر ڈاکٹروں کا اصرار بڑھتا رہا۔ آخر انہیں صاف بتانا پڑا کہ ایک بے دست و پا مریض کی حیثیت سے مجھے کراچی جانے کے خیال سے وحشت ہوتی ہے۔ مس جناح نے بھی کہا کہ بھائی کو بیماری کی حالت میں گورنر جنرل ہاؤس واپس نہیں جانا چاہیئے۔

بے لچک اصول پرستی

آخر کار ایک متبادل انتظام کے طور پر وہ اور ڈاکٹر ملیر منتقل ہونے پر متفق ہو گئے اب ایک اور دشواری پیش آئی۔ ملیر میں قائداعظم کے قیام کے لیے جو مکان موزوں تھا وہ نواب صاحب بہاولپور کی ملکیت تھا اور وہ بحیثیت گورنر جنرل نہیں چاہتے تھے کہ مکان کے لیے نواب صاحب سے درخواست کریں۔

کم کھانے کی عادت

اگست کے اواخر میں یکایک ان کی غذا پھر کم ہو گئی۔ توانائی کو قائم رکھنے کا سہارا نہ رہا۔ ڈاکٹر پریشان ہو کر ان سے بار بار کچھ نہ کچھ کھانے کی درخواست کرنے لگے۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

"ڈاکٹر، میں نے اچھی حالت میں بھی کبھی اتنا نہیں کھایا۔ جتنا آپ کھلانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ زیادہ کھانا مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے"؟

اگست کے آخری دنوں میں وہ بہت اداس اور محزون نظر آنے لگے تھے۔ علاج اور کھانے ہی میں نہیں سب چیزوں میں ان کی دلچسپی کم ہونے لگی تھی۔ ان کی افسردگی کو دیکھ کر ڈاکٹر الٰہی بخش نے کہا، "سر، آپ جس ریاست کو وجود میں لاتے ہیں اُسے پوری طرح مستحکم اور استوار ہونے کے لیے ابھی سالہا سال تک آپ کی ضرورت ہے"۔

قائداعظم نے آبدیدہ ہو کر فرمایا:

"میں اپنا کام پورا کر چکا ہوں اب میرا مرنا جینا برابر ہے"۔

اور نڈھال ہو کر خاموش ہو گئے۔

قوتِ ارادی سے زندہ

وہ ایک عرصے سے اس مہلک مرض کی گرفت میں تھے لیکن پاکستان کو منزل مراد تک پہنچانے کی خاطر زندہ رہنے کی شدید خواہش اور ارادے نے ساتھ چھوڑا تو فانی جسم بکھرنے لگا۔ لیکن یہ ان کی ہار نہیں جیت تھی۔ وہ ایک مقصد کی خاطر زندہ تھے اس کے حصول کے بعد محض زندہ رہنے میں ان کی عظمت کا ایک

انوکھا پہلو تھا۔ ۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کو نمونئے کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ وہ ٹیکوں سے گھبراتے تھے لیکن ڈاکٹروں کے اصرار پر ایک اچھے مریض کی طرح انہوں نے تکلیف دہ ٹیکے بھی لگوائے۔ لیکن بات نہ بنی ۶ ستمبر کی صبح سے سانس لینے میں گھٹن کم کرنے کے لیے کمرے کی کھڑکیاں کھلوا دیں اور میز کا پنکھا لگوا دیا بعد کو آکسیجن دینے سے کچھ تکلیف میں کمی ہوئی۔ ۹ ستمبر کو ریڈیو سے خبریں سننے کی خواہش ظاہر کی۔

کشمیر کے مسئلے سے دلچسپی

وہ چند دنوں سے خاص طور سے کشمیر کے خیال میں غلطاں و پیچاں تھے ایک بار تیز بخار اور بے چینی کے عالم میں، مس جناح نے انہیں اس مسئلے کے متعلق بڑ بڑاتے سنا۔ ایک بار نیم بے ہوشی کی حالت میں وہ یہ کہتے سنے گئے: "کشمیر کمیشن کو آج مجھ سے ملنا تھا وہ اب تک کیوں نہیں آئے کہاں چلے گئے"۔ کشمیر ان کے لاشعوری ذہن میں رچا ہوا تھا۔ وہ آخری سرکاری کاغذات پر جن پر انہوں نے بصد مشکل اپنے دستخط ثبت کیے اقوام متحدہ میں پاکستانی نمائندے کے اختیارات کے بارے میں تھے۔

غروب آفتاب

اصل میں اب سورج ڈوبنے لگا تھا۔ کشتی کے لنگر ٹوٹنے لگے تھے۔ ڈاکٹروں نے مس فاطمہ جناح کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہیں خود بھی اندازہ ہو گیا تھا۔

کہ ان کے عظیم بھائی نے جسم کی فانی سرحدوں سے روح کے لافانی ساحلوں کی طرف سفر شروع کر دیا ہے۔

اصول اور قوتِ ارادی کا معجزہ

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو جب قائداعظم کو اسٹریچر پر لٹا کر ہوائی اڈے کی طرف پہنچایا جا رہا تھا تو جہاز کے ہوا بازوں نے انہیں سلامی دی۔ کرنل الہی بخش لکھتے ہیں "مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ انہوں نے اس کا بڑا چستی سے ہاتھ اُٹھا کر جواب دیا۔ نقاہت کے مارے انکی یہ حالت ہوگئی تھی کہ بستر پر کروٹ لینے میں بھی دقت محسوس ہوتی تھی۔ اور کوشش کے بغیر کھانس بھی نہیں سکتے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ اس ناتوانائی میں سلامی کا اس سرگرمی سے جواب دینے کی طاقت ان میں کہاں سے آئی۔ ان کے ہاتھوں کی اس یادگار جنبش سے ٹپکتا تھا کہ بستر مرگ پر بھی وہ ضبط و نظم کے تقاضے سے غافل نہیں تھے۔"

جہاز میں انہیں آکسیجن دی جاتی رہی۔ سوا چار بجے گورنر جنرل کا خاص جہاز ماڑی پور کے اڈے پر اُترا۔ ایمبولنس چار میل چلنے کے بعد خراب ہوگئی۔ دو گھنٹے کے بعد دوسری گاڑی آئی۔ شام تک گورنر جنرل ہاؤس تک کا مختصر راستہ طے ہوا۔ اس تکلیف دہ سفر کو قائداعظم نے برداشت کر لیا لیکن سوا نو بجے حالت بگڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے طاقت کا ٹیکہ لگایا اور کہا: جناب ہم نے آپ کو طاقت پہنچانے کا ٹیکہ لگایا ہے جلد ہی اس کا اثر ہو گا خدا کو منظور ہوا تو آپ زندہ سلامت رہیں گے"۔ جواباً سر ہلاتے ہوئے

نحیف آواز میں کہا "نہیں، اب نہیں"۔
پھر کچھ کہا۔ جس کے دو لفظ اللہ...... اور پاکستان سمجھ میں آسکے۔ اس کے بعد ان پر بے ہوشی سی طاری ہو گئی دس بج کر بیس منٹ پر جب ڈاکٹر الٰہی بخش نے ان کے دل کی حرکت کو سننے کی کوشش کی تو کسی حرکت کا احساس نہ ہوا۔ جس دل کی دھڑکن سے کبھی طوفانوں کے دل دھل جاتے تھے۔ وہ دل بڑی خاموشی سے اپنے رب کے ایک اشارے پر خاموش ہو چکا تھا۔

اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر

اِنّا للہ وَاِنّا الیہ راجعون

آخری باتیں

آٹھ دس ہفتے کی اس علالت کے دوران میں بھی جب قائداعظم صاحب فراش تھے وہ تقریباً آخری دنوں تک اپنے فرض منصبی کی ذمہ داریاں بڑے انہاک اور دلچسپی سے ادا کرتے رہے ان کے دل و دماغ کی تابندگی اور چستی میں آخری لمحات تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی بہن، سیکرٹری اور معالجوں سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے تھے بلکہ بحث بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹروں سے دواؤں، پرہیز اور علاج کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے تھے انہی مجلسوں میں وہ مختلف قومی مسائل اور مباحث پر اظہار خیال بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کے سیکرٹری فرح این، ڈاکٹر کرنل الہی بخش اور خوش قسمتی سے ان کے دوسرے معالج ڈاکٹر ریاض علی شاہ صاحب نے اپنی ڈائری "قائداعظم کے آخری لمحات میں" قائداعظم کے ان تاثرات کو تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔

موت اور زندگی

۲۷ جولائی ۱۹۴۸ء کو قائداعظم نے ڈاکٹر ریاض شاہ سے طبی معائنے کے دوران کہا:

"میں نے آج تک کبھی اپنی صحت کی پرواہ نہیں کی۔ اور نہ آئندہ کے

لیے خیال کرنے کو تیار ہوں ۔موت اور زندگی سب خدا کی طرف سے ہے موت وقت معین سے پہلے نہیں آ سکتی ۔یہ میرا ایمان ہے ۔ میں خُدا وند قدوس کی ذات کے سوا اس دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ موت کا خوف مجھ پر طاری نہیں ۔جب موت کو آنا ہے اور ضرور آنا ہے تو پھر موت سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں"۔

پاکستان کی ایک زندہ حقیقت ۔ بے انتہا امکانات

قائداعظم نے فرمایا :

"پاکستان ایک زندہ حقیقت ہے ایک ایسی حقیقت جس کا دوست اور دشمن سب ہی اعتراف کرنے پر مجبُور ہیں ۔ پاکستان کا مستقبل درخشاں ہے ۔ میری روح کو تسکین ہے ۔میرے دل کو اطمینان ہے کہ برصغیر میں مسلمان غلام نہیں ۔ بلکہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے آزاد مملکت کے مالک ہیں آج وہ ایک ایسی مملکت کے مالک ہیں جس کے وسائل و ذرائع لامحدود ہیں۔ آج اپنا وطن ہے آزاد اور خود مختار وطن ۔جس کی ترقی کی شاہراہیں وسیع ہیں اور جس کا مستقبل روشن ہے"۔

سجدۂ شکر

"جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آزاد ہے تو میرا سر عاجزی سے بارگاہ رب العزت میں جھک جاتا ہے" ۔ یہ کہہ کر قائداعظم کی آنکھوں میں چمک آگئی، چہرے پر سرخی دوڑ گئی ۔ آواز بلند ہوتی گئی ۔ آپ نے کہا :

"یہ مشیت خداوندی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض کہ جس قوم کو برطانوی اور ہندو سامراج نے برصغیر سے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی۔ آج وہ قوم آزاد ہے، اس کا اپنا ملک ہے۔ اپنا جھنڈا ہے۔ اپنی حکومت، اپنا سکہ ہے اور اپنا آئین و دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا کوئی اور انعام ہو سکتا ہے؟ یہی وہ خلافت ہے جس کا وعدہ خدا نے رسول اکرمؐ سے کیا تھا۔ اگر تمہاری امت نے صراطِ مستقیم کو اپنے لیے منتخب کر لیا تو ہم اِسے زمین کی حکومت دیں گے۔ خدا کے اس انعامِ عظیم کی حفاظت اب سب مسلمانوں کا فرض ہے۔ اگر مسلمان نیک نیتی، دیانت داری، خلوص اور نظم و ضبط سے دن رات کام کرتے رہے۔ اور اگر ان میں ذاتی مفاد، جاہ طلبی، اور نفاق کا مرض پیدا نہ ہوا تو انشاءاللہ چند سالوں میں دُنیا کی بڑی قوموں میں انکا شمار ہونے لگے گا۔ ان کا ملک امن و آشتی، تہذیب و تمدن، ثقافت و شرافت کا مرکز ہوگا اور اس کی حدود سے ترقی کی شعاعیں نکل کر سارے ایشیا کی رہنمائی اور رہبری کریں گی۔ اور ایشیا کو امن و ترقی کا راستہ دکھائیں گی۔"

پاکستان کے صنعتی ملک بننے کے امکانات

ایک شام آپ نے فرمایا: " میں جانتا ہوں کہ پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ لیکن صنعتی میدان میں آنے سے پہلے جاپان کے وسائل پاکستان سے بھی کم تھے۔ نہ کوئلہ تھا اور نہ لوہا۔ دوسری دھاتیں بھی ناپید تھیں۔ لیکن

جب جاپانیوں نے اپنے ملک کو صنعتی بنانے کا عزم کر لیا تو انہوں نے ہر مشکل پر قابُو پا لیا۔ ہر دشواری کو آسان بنا دیا۔ ناممکن کو ممکن بنا دیا۔پاکستان زرعی ملک ہے لیکن پاکستان کو صنعتی ملک بنانے کے لیے تمام وسائل ذرائع اور معدنیات ملک میں موجُود ہیں۔ پاکستان کے پہاڑی علاقے، میدان اور ریگستان بے اندازہ قدرتی وسائل کے حامل ہیں۔ ضرورت محنت اور کوشش کی ہے"۔ یہ کہنے کے بعد پاکستان کے علاقوں کی صنعتی پسماندگی کی وجوہات پر بھی آپ نے روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا:

"پاکستانی علاقوں کے متعلق برطانوی حکومت کی شروع سے یہ پالیسی رہی ہے کہ مسلمانوں کو صنعت، تجارت اور تعلیم کے میدان میں پسماندہ رکھا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز مسلمانوں کو اپنا حریف سمجھتے تھے انہیں یقین تھا اگر مسلمان صنعتی، تجارتی اور تعلیمی میدان میں ترقی کریں گے تو لازمی طور پر وہ اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کی منظّم جدوجہد کریں گے اور برطانوی اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوں گے۔ اس مفروضے کی بنا پر انگریزوں نے اپنے دو صد سالہ دورِ حکومت میں ہندوؤں کو ہر میدان میں ابھارا اور مسلمانوں کو قصداً پسماندہ رکھا۔"

زیارت سے کوئٹہ آنے پر قائدِاعظم کی طبعیت قدرے بہتر ہو گئی ان دنوں وہ اکثر پاکستان کی صنعتی ترقی پر اظہارِ خیال کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان کے مستقبل کے علاوہ وہ کسی اور موضوع پر سوچتے ہی نہیں تھے۔

مسلمانوں سے پُرامید

ایک دوسرے موقعہ پر آپ نے کہا، " پاکستان کو ترقی دینے کے ذرائع اس ملک میں موجود ہیں۔ قدرت کی فیاضی نے اس ملک کو دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ضرورت صرف محنت، خلوص اور دیانت داری کی ہے اگر پاکستانی مسلمانوں میں یہ اوصاف پیدا ہو جائیں"۔ یہ کہہ کر ذرا ٹھہرے پھر پُورے یقین سے کہا:

" انشاء اللہ میری قوم میں یہ اوصاف پیدا ہو کر رہیں گے۔ میں مسلمانوں سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ اسلامی تعلیمات میں مایوسی کا لفظ تک نہیں، زندہ قوموں کو انتہائی مصائب اور مشکلات میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے مصائب و آلام کی آندھیوں، مشکلوں کے طوفانوں، دشمن کی مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ خُدا ہمیشہ ان قوموں کو آزمائش میں ڈالتا ہے جنہیں وہ زمین کی خلافت عطا کرنا چاہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ صدیوں کی غلامی نے مسلمانوں کے دماغوں کو شل کر دیا ہے انہیں ابھی تک اس کا شعور بھی نہیں کہ اب وہ ایک آزاد قوم ہیں۔ انہیں آزاد قوم کی طرح ملک کی تعمیر میں حصہ لینا چاہیے جب بھی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا اور وہ محسوس کرنے لگے کہ وہ آزاد ہو چکے ہیں تو اس کے بعد پاکستان کے عظیم ملک بننے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی"۔

مستقبل سے پُرامید

آغازِ پاکستان کے انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود قائدِاعظم پاکستان کے

مستقبل کے بہت پر اُمید تھے "میں آپ میں موجود نہیں ہوں گا لیکن آپ دیکھ لیں گے کہ پاکستان چند ہی سال میں دنیا کا عظیم ترین ملک بن جائے گا. پاکستان میں مردم خیزی کی صلاحیت موجود ہے بہترین دل و دماغ کے انسانوں کی کمی نہیں - ذرا دماغوں پر زنگ لگ گیا ہے جب زنگ اُتر گیا تو پاکستان ایسے گوہرِ گراں قدر پیدا کرے گا. جن کی فہم و فراست، تدبر اور قوت سے پاکستان زندگی کے ہر میدان میں قابلِ رشک ترقی کرے گا"۔

دماغوں کو زنگ لگنے کا سب سے بڑا سبب مروّجہ نصاب تعلیم اور طریق تعلیم تھا.

قائداعظم کی ہمہ گیر نظر اس پہلو پر بھی تھی چنانچہ اس سلسلے میں آپنے فرمایا:

"موجودہ نصاب اور طریق تعلیم غلام سازی کی محرک ہیں. ملکی اور قومی ضروریات کے مطابق انہیں قطعاً بدل دینا ہو گا. نوجوانوں اور بچوں کو شروع ہی سے ان کے ذہنی رجحانات کے مطابق تعلیم دینی ہو گی"۔

زیارت سے کوئٹہ آکر اُنکی صحت تو بہتر ہو گئی لیکن طبیعت افسردگی کی طرف مائل تھی۔ ڈاکٹروں نے امید ظاہر کی کہ ان کی صحت پہلے چند سال کی طرح اچھی ہو جائے گی - اس پر انہوں نے کہا:

"چند سال پہلے یقیناً میری یہ آرزو تھی کہ میں زندہ رہوں - زندگی کی خواہش اس لیے نہیں تھی کہ میں موت سے ڈرتا تھا بلکہ اس لیے زندہ رہنا چاہتا تھا کہ قوم نے جو کام میرے سپرد کیا تھا اور قدرت نے جس کام کے لیے مجھے مقرر کیا ہے میں اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں. اَب وہ کام پُورا

ہو چکا ہے۔ اب یہ قوم کا کام ہے وہ اس کی تعمیر کرے۔ اُسے مضبوط اور
ترقی یافتہ بنائے، میں اپنا فرض پورا کر چکا اب مجھے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں"

اس پر ڈاکٹر کرنل الہی بخش اور ڈاکٹر ریاض علی شاہ نے بیک آواز کہا:
خدا آپ کو تادیر سلامت رکھے۔ آپ کے بعد کون ہے جو قوم کی کشتی کو اس
بھنور سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچا سکے۔ قائداعظم نے آسمان کی طرف
انگلی اُٹھائی اور فرمایا،

"قدرت حالات کے مطابق ایسا آدمی پیدا کر دیا کرتی ہے جس کی وقت
اور حالات کو ضرورت ہوتی ہے"۔

پھر اپنی گمبھیر آواز میں گویا ہوئے۔
"گھبراؤ نہیں، خدا پر اعتماد رکھو۔ اپنی صفوں میں نقص نہ آنے دو۔ انتشار نہ پیدا
ہو، دیانت اور خلوص کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ قوم کے مفاد کو ذاتی مفاد
پر کبھی ترجیح نہ دو"۔

ان کی صحت پھر گرنے لگی تھی لیکن ان کی سوچ کا مرکز پاکستان اور
اس کا مستقبل ہی تھا پاکستان کے دفاع میں ان کی دلچسپی سب سے زیادہ
تھی۔ ایک دن، اور یہ دن اُنکی زندگی کے بالکل آخری دنوں میں سے ایک تھا،
فرمایا:

" اندرونی اور بیرونی دفاع کا مسئلہ خاص طور پر توجہ طلب ہے، پاکستان
کا ہر مرد اور پاکستان کی ہر عورت اپنے آپ کو قومی سپاہی تصور کرے۔ ہم
نے لاکھوں مسلمانوں کو قربانی دے کر جو آزادی حاصل کی ہے اس کی حفاظت

کے لیے ہمیں ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے ۔ بھوکے رہ کر
ملک کی دفاعی ضروریات کو پورا کرنا چاہیے ۔ مجھے یقین ہے اگر کسی دشمن نے
پاکستان کی آزادی پر حملہ کیا تو پاکستان اپنے آخری فرزند تک حملہ آور کے خلاف
جنگ جاری رکھے گا ۔ حکومت پاکستان اور پاکستانی عوام کو دفاع کے سوال کو
تمام دوسری ضروریات پر مقدم رکھنا چاہیے "۔

چین کے ایک نامور شاعر کا نذرانۂ عقیدت

جناح ! اے استقامت ، جہاد اور انقلاب کے نشان!
جسے صحراؤں کے خانہ بدوش بھی پہچانتے تھے ،
اور سندھ کے کناروں پر بسنے والے بھی ،
میرا ٹوٹا ہوا دل آج غم کے مقابلے میں عاجز ہے۔
میں رونے پر مجبور رہوں۔
اگرچہ آنسو میرے غم کی شدت کے اظہار سے قاصر ہیں۔
جناح! روح انسانی تجھے کبھی نہ بھول سکے گی!
حکمرانوں کی نخوت اور دشمنوں کی لذت خون آشامی برقرار رہے گی،
لیکن تو صبر و اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کر لے
کیونکہ جنگلوں میں،
اور ساحلوں پر
تیرے بیٹے (ہی نہیں)
تیری بیٹیاں (بھی)
تلواریں ہاتھوں میں لیے

حق کی حمایت کرتی رہیں گی۔
وہ تیرے طویل جہاد کو
از سرِ نو شروع کریں گے
اور یہ نسل ہی
تیرا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا دے گی!
یہ صرف ایک نوحہ نہیں،
حلف ہے!

(لوہ ینگ)

قائداعظم کی عظمت کا تجزیہ

قائداعظم کی غیر معمولی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اندھی عقیدت یا اندھی وفاداری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نہ انہوں نے خود کسی کو بُت بنایا تھا نہ انہیں خود بُت بننا منظور تھا۔ وہ تجزیاتی اور تجرباتی ذہن رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ پاکستانی عوام و خواص بھی یہی غیر جذباتی ذہن رویہ اختیار کریں تاکہ وہ موجودہ زمانے کے پیچیدہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہو سکیں۔

قائداعظم بلاشبہ اس دور کی عظیم شخصیت تھے ان کی عظمت کا اعتراف ان کے دوستوں ہی نے نہیں دشمنوں نے بھی کیا ہے۔ سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ ان کی عظمت کا راز کیا تھا؟ کس چیز نے قائداعظم کو قائداعظم بنایا۔ وہ کونسی صفات تھیں جن کی وجہ سے وہ تخلیق پاکستان کی جنگ اتنے نامساعد حالات میں جیت سکے؟

اس سلسلے میں ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ عظمت ذاتی نہیں اجتماعی ہوتی ہے ایک لیڈر کو حالات اور تاریخی عوامل کا دھارا عظیم بنا دیتا ہے۔ لیڈر کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تاریخی عوامل کے دھارے کو خاطر

خواہ رُخ دے سکے اور اجتماعی طاقت سے اپنی فراست کے مطابق کام لے سکے۔ اس نقطۂ نظر کا جواب یہ ہے کہ یہی تو عظمت ہے، تاریخی عوامل کی طاقت کو اپنے قومی مفاد کے مطابق زیر کر لینا ہی تو بڑائی ہے۔ حالات اور عوامل تو سب کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔ جو ان سے خاطر خواہ کام لے سکے اسی کو تو "میر کارواں" کہتے ہیں۔

شخصیت کی تکون کے تین ضلعے ہوتے ہیں وراثت، ماحول اور کردار قائداعظم کی عظمت کو ان ہی تین گوشوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے نسلی اور خاندانی خصوصیات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

"نقوش قائداعظم" نامی کتاب میں اسد ملتانی کی روایت اور قائداعظم کے حوالے سے لکھا ہے کہ قائداعظم نسلاً پنجابی راجپوت تھے۔ پورا واقعہ یوں ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں جب قائداعظم باغبت ضلع میرٹھ کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوتے تھے تو نواب باغبت نے قائداعظم سے کہا آپ کا خاندان تو تجارت پیشہ ہے آپ میں یہ کرکٹ کہاں سے آئی؟ اس پر قائداعظم نے مسکرا کر جواب دیا، نواب صاحب میں تو پنجابی راجپوت ہوں کئی پشتیں گزریں میرے ایک جد کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے وہاں انہوں نے ایک خوجہ لڑکی سے شادی کر لی اور انہی کے خاندان میں مل گئے۔ اس وقت سے ہم لوگ خوجوں میں شمار ہونے لگے۔ میرے وہ جدّ جو کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے۔ ضلع منٹگمری کے رہنے والے تھے۔

اس روایت کی تصدیق کسی اور سوانح نگار نے نہیں کی ہے۔ کتاب

قائداعظم جناح کے معتبر مصنف جی الانہ نے جنہیں قائداعظم سے مدتوں ذاتی شرف نیاز حاصل رہا تھا صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ محمد علی جناح کے آباؤ اجداد کاٹھیاواڑ کے رجواڑے گونڈل کے گاؤں پانیلی کے باشندے تھے۔ ان کے دادا پونجا میگھ جی کا کپڑے بُننے کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ اور ان کا شمار گاؤں کے شرفاء میں ہوتا تھا۔ پونجا میگھ جی کے تین بیٹوں، والجی بھائی نتھو بھائی، جناح بھائی ہیں سے سب سے چھوٹے جناح پونجا سب سے زیادہ باہمت باحوصلہ تھے اور تجارتی ذہن رکھتے تھے۔ اپنی تجارتی تگ و تاز کے لیے گونڈل کا میدان تنگ پاکر جناح پونجا کراچی منتقل ہو گئے اور اپنی تجارتی فراست و ذہانت اور محنت سے انہوں نے ایکسپورٹ امپورٹ اور بینکاری کے کاروبار کو خوب چمکایا۔

لیکن جناح پونجا محض کاروباری آدمی نہیں تھے وہ کراچی کے لیے انگریزی اسکول چرچ مشن میں استاد بھی رہے تھے خود بھی انگریزی جانتے تھے۔ سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے کراچی کے باشعور مسلمانوں کے ساتھ ۱۸۸۵ء میں سندھ مدرستہ الاسلام کی بنیاد رکھنے میں عملی مدد دی تھی۔ محمد علی جناح کے ننھیال کے بارے میں بھی کچھ نئی معلومات منظر عام پر آئی ہیں۔ جو انکی وراثت کے مطالعہ میں اہمیت رکھتی ہیں۔ محمد علی کی والدہ شیریں بی جو سسرال میں اپنے حسن صورت وسیرت کی وجہ سے مٹھی بائی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ نسلاً ایرانی تھیں۔ وہ آغا خان اول کے ایک وزیر موسیٰ جمعہ کی بیٹی تھیں ۱۸۷۴ء

ہیں انکی شادی جناح پونجا سے ہوئی تھی۔ شیریں بی کا خاندان اپنی نجابت، شرافت اور علم و فضل میں یکتائے روزگار تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ شیریں بی فہم فراست میں یگانہ ہونے کے ساتھ ساتھ علم و فضل میں بھی کچھ نہ کچھ دخل تو ضرور رکھتی ہوں گی۔ فارسی عربی تو جانتی ہی ہوں گی۔ اسماعیلی عقیدہ تو خیر پونجا خاندان کا بھی تھا اسماعیلی ناصر امام آغا خان سے اتنا قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے مذہبی قدروں سے ان کی وابستگی بھی زیادہ ہو گی۔ کہا جاتا ہے کہ محمد علی جناح کا نام "محمد علی" ان کے ماموں اسماعیلی امیر کبیر قاسم موسیٰ نے رکھا تھا۔ ان کی ماں پیار سے انہیں محمد کہتی تھیں۔ جناح پونجا کے گھرانے کے گجراتی ماحول میں یقیناً یہ نئی چیز ہو گی۔ یہ تحقیق تو نئی ہے اس سے پہلے بھی محمد علی جناح کی والدہ کے بارے میں جو معلومات تھیں ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مذہبی دل و دماغ کی نہایت سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ وہ پانیلی کے ایک اسماعیلی صوفی بزرگ حسن پیر سے عقیدت رکھتی تھیں۔ انہی کے اصرار پر محمد علی کو عقیقے کے لیے حسن پیر کی درگاہ پانیلی لے جایا گیا تھا اور وہاں پورے روایتی انداز سے ان کے عقیقے کی رسوم ادا کی گئیں۔ ان حقائق سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی جناح کے ماں باپ دونوں روشن دماغ اور روشن ضمیر تھے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے باپ سے انہوں نے ہمت و حوصلے سے کام کرنا محنت کرنا اپنے اُوپر اعتماد کرنا۔ نئی راہیں نکالنا اور جزرسی سیکھی۔ ماں کی طرف سے شائستگی، نفاست اور مذہبی و اخلاقی قدروں سے وابستگی انہیں ورثے

میں ملی۔

لیکن قائداعظم کی عظمت کو محض وراثت اور خاندان کے اثرات کے حوالے سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان کے پائے کے عظیم انسان اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ لندن میں اپنی تجارتی فرم کی ناکامی پر انہوں نے خود ہی قانون پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ بھی ان کا اپنا تھا ان دو فیصلوں کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں وہ بھی انہوں نے خود اپنی فراست خود اعتمادی، قوت ارادی سے عبور کیں۔

۱۸۹۶ء میں جب وہ بیرسٹر بن کر کراچی واپس آئے تو ان کے والد کا کاروبار مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ خاندان مالی بحران کا شکار تھا۔ بظاہر بہتر یہی نظر آتا تھا کہ وہ کسی قانونی فرم میں ملازم ہو جاتے اور اپنی مالی حالت کو مستحکم کرتے۔ ایسی ملازمتوں کے امکانات بھی موجود تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ایسی جگہیں انہیں پیش بھی کی گئیں۔ لیکن محمد علی نے اس جال میں پھنسنے سے انکار کر دیا اور صرف اپنے حوصلے اور عزم کو ساتھ لے کر وسیع تر امکانات کے شہر بمبئی میں اپنے لیے نئی منزلیں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔

نہ صرف انہوں نے اپنے آبائی پیشے تجارت کو خیر باد کہا۔ بلکہ آبائی عقیدے میں بھی اپنی فہم اور رائے کے مطابق ترمیم کی۔ انکے خاندان کے سب لوگ اسماعیلی شیعہ عقیدے کے تھے۔ آغا خان کو امام حاضر مانتے تھے۔

ابوالحسن اصفہانی کی روایت کے مطابق انہوں نے اکیس سال کی عمر میں آبائی عقیدے کو چھوڑ کر اپنے سارے خاندان سمیت اثنا عشری مسلک اختیار کر لیا۔ بلکہ خود آغا خان کو بھی ترغیب دی کہ وہ بھی اثنا عشری مسلک کی طرف رجوع کریں۔ یہ ان کی خود نگری کی بہت واضح مثال ہے۔ مختصر یہ کہ انہیں والدین سے بھی بہت کچھ ملا۔ ماحول سے بھی انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ تعلیم و تربیت نے بھی ان کے جوہر چمکائے۔ لیکن وہ صفات وہ قدریں، وہ رویے، وہ عادات، وہ اصول وہ کردار اور وہ ذہن جس نے انہیں چمڑے کے ایک تاجر کے بیٹے سے ایک قوم کا قائداعظم اور ایک ملک کا خالق بنا دیا اور وہ ان کے انفرادی کردار کا کارنامہ تھا اس لیے ان کی عظمت کا سراغ ان کے کردار کے تجزیے سے مل سکتا ہے۔

اس لحاظ سے ان کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے کردار کی دو خصوصیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو اپنے لیے خود سوچ سکنا۔ اپنے لیے خود فیصلہ کر سکنا اور پھر اس خود اعتمادی سے کیے ہوئے فیصلے کو بر وئے کار لانے کے لیے ارادے کی غیر معمولی قوت۔

سب سے مشکل کام دوسروں کے مشورے اور حالات کے رُخ کے خلاف اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے ذہانت ہی نہیں ذہنی جرأت بھی چاہیے۔ اس کے بعد اس فیصلہ پر حوصلے سے عمل کرنے اور کرتے رہنے میں اپنے اُوپر اعتماد کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اپنے مقصد پر اعتماد کی بھی اور محنت و جفاکشی کی عادت کی بھی۔ قائداعظم محمد علی جناح کے

کردار میں یہ تینوں صفتیں۔ قوتِ فیصلہ۔ قوتِ ارادی اور بے انتہا اور مسلسل محنت کی صلاحیت کمال کے درجے میں موجود تھیں۔ سندھ مدرسے کی طالب علمی کے زمانے میں وہ رات گئے تک پڑھتے تھے۔ اور اس روز کا کام ختم کیے بغیر نہیں سوتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار ایک رشتے دار خاتون نے انہیں صحت کی خاطر دیر تک پڑھنے سے منع کیا تو انہوں نے کہا بائی جی میں محنت نہیں کروں گا تو بڑا آدمی کیسے بنوں گا؟ انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ خود کیا۔ وہیں لندن میں اٹھارہ انیس برس کی عمر میں انہوں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی اور خود فیصلہ کیا کہ وہ عملی سیاست میں حصہ لیں گے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے۔ بلکہ ایک موقعہ پر تو انہوں نے دادا بھائی نوروجی کی طرح انگلستان میں رہ کر انگلستان کی پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے اور انگریز سیاست دانوں سے برابری کی سطح پر ٹکر لینے کے بارے میں بھی سوچا۔ سیاست میں حصہ لینے کا جو فیصلہ انہوں نے آغاز جوانی میں کیا تھا اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ کوئی ذاتی فائدہ نہ آسکا۔

جب انہوں نے ۱۹۰۰ء میں بمبئی میں پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی عارضی جگہ قبول کی تو یہ فیصلہ بہت سوچ کر کیا گیا تھا۔ جیسے ہی وکالت جمنے کے امکانات ہوئے انہوں نے اس جگہ کو اس زمانے کے ۱۵۰۰ روپے ماہوار پر مستقل طور پر قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اتنی رقم تو میں ہر روز کمانا چاہتا ہوں۔ انہیں اپنے اُوپر اعتماد تھا ان کی نظر

مستقبل پر بھی ان کے ارادے میں اتنی قوت تھی کہ جو مشکل فیصلہ کریں اس کو آخر تک نبھائیں بھی۔ خواہ وہ بہن رحمت بائی کی برادری سے باہر شادی کا مسئلہ ہو یا چھوٹی بہن فاطمہ کو باندرہ کے کانونٹ اسکول میں پڑھانے کا مسئلہ یا خود اپنی شادی اور پھر علیحدگی کی بات، یا بیٹی دینا کو عاق کر دینے کا فیصلہ یہ ان کے اپنے فیصلے تھے اور انہوں نے اپنی قوت ارادی اور فراست سے انہیں آخر وقت تک نبھایا۔ یہی معاملہ سیاسی فیصلوں کا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے جدو جہد کرنے کا عہد کیا تھا۔ تمام عمر وہ اس پر قائم رہے اسی زمانے میں وہ آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کے قائل تھے۔ اس معاملے میں وہ بیشتر کانگریسی ہندو لیڈروں سے زیادہ مخلص تھے۔ ۱۹۱۶ء کا لکھنؤ پیکٹ۔ ۱۹۲۹ء کے ۱۴ نکات، ۱۹۳۲ء کی گول میز کانفرنس، ۱۹۳۷ء کے انتخابات سے ۱۹۴۶ء کے کیبنٹ مشن تک انہوں نے نہایت ایمانداری اور سچائی سے مسلمانوں کے جائز مفادات کے تحفظ کے ساتھ اتحاد کی کوشش کی۔ یہ وفاداری بشرط استواری کی بہترین مثال تھی۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریک عدم تعاون سے تعاون نہ کرنا ان کی قوت فیصلہ اور سیاسی فراست کا بہت سخت امتحان تھا۔ عوامی لیڈروں کے لیے عوام کے جذبات اور رجحان کے خلاف فیصلہ کرنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن محمد علی جناح اس سخت امتحان سے بھی کامران گزرے۔ اس سے پہلے وہ رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے طور پر وائسرائے کی کونسل کی رکنیت سے استعفی

دے چکے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں انگلستان سے آکر انہوں نے مسلم لیگ کو ایک فعال اور منظم عوامی جماعت بنانے کا تاریخی فیصلہ کیا تو کم و بیش وہ تنہا تھے۔ اس زمانے کے بڑے مسلمان لیڈر مسلم لیگ میں نہیں تھے۔ مسلم لیگ کو منظم کرنے کے سلسلے میں وہ اے کے فضل الحق، سہروردی، سر سکندر، ایسے بااثر لیڈروں سے نپٹتے رہے اور جب ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے رویے سے ان کو یقین ہو گیا کہ ہندو مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق دینے پر کسی قیمت پر تیار نہیں تو انہوں نے پاکستان سے کم تر کسی چیز پر راضی ہونے سے انکار کر دیا اور ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء سے قرارداد پاکستان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ سن ۴۲ کا کرپس مشن۔ سن ۴۵ کی شملہ کانفرنس اور ۱۹۴۶ء کا کیبنیٹ مشن۔ سارے سیاسی مذاکروں میں ان کے فیصلے اور ارادے کے بڑے بڑے امتحان آئے لیکن وہ پہاڑ کی طرح جمے رہے اور آخر کار ۳۔ جون ۴۷ء کے اعلان سے پاکستان کا قیام ممکن ہوا۔

ان کی قوتِ ارادی کا امتحان جسمانی سطح پر بھی ہوا۔ ۴۱ء سے انکی صحت متاثر ہونے لگی تھی۔ سن ۴۵۔ ۴۶ اور ۴۷ء کے تین سالوں میں وہ مہلک بیماری اثر کرنے لگی تھی۔ لیکن صرف اپنی قوت ارادی اور جذبے سے انہوں نے بیماری کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیا اپنی آخری علالت میں وہ اگست ۱۹۴۸ء کے اواخر تک فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ یکم جولائی ۴۸ء کو اسٹیٹ بنک کے افتتاح کے لیے وہ علالت کے بستر سے اُٹھ کے آئے تھے۔ ان کی جرأت کا ایک امتحان تو فروری ۴۳ء میں

آیا تھا۔ جب رفیق صابر نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ ان کے عزم و حوصلے امتحان کا وہ وقت بھی کم نہیں تھا۔ جب ۵۔ اگست ۴۷ء کو وہ نجی ملاقات میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں بتایا کہ سی آئی ڈی کی اطلاعات کے مطابق ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں آزادی کی تقریبات کے دوران سکھوں کی طرف سے اُن پر قاتلانہ حملے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ یہ خفیہ اطلاع اُنہوں نے سکھوں سے سُنی اور پھر اعتماد سے کہا۔ آزادی کی تقریبات اپنے پروگرام کے مطابق منعقد ہوں گی۔ جی الانہ نے لکھا ہے کہ قتل کے اس منصوبے کی اطلاع ستر برس سے زائد عمر میں بھی ان کی قوتِ ارادی، حوصلے اور اعتماد کو متزلزل نہ کر سکی۔ خوف وہ چیز تھی جس سے وہ واقف ہی نہیں تھے۔

صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنے کی فراست اور پھر اس فیصلہ پر پختہ عزم و حوصلے کے ساتھ قائم رہنے کی جرأت اور قوت، یہ قائدِ اعظم کی کردار کی دو اہم خصوصیتیں تھیں۔ لیکن ایک تیسری خصوصیت بھی جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ یعنی ان کا وہ جذباتی نقطہ نظر تھا۔ وہ جذباتی فیصلے نہیں کرتے تھے بلکہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر تمام مضمرات پر نظر کر کے ذاتی اور سیاسی فیصلے کرتے تھے وہ جذباتی تو تھے حساس بھی بہت تھے۔ لیکن جذباتیت کا شکار نہیں تھے۔ ۱۹۱۷ء میں وہ سرڈنشا پیٹٹ کی اس تجویز پر راضی ہو گئے کہ رتن بائی ان سے شادی کرنے کے ارادے کو ایک سال تک ملتوی کر دیں اس سے ان کے دل کو ضرور تکلیف ہوئی ہو گی۔ لیکن جیسا کہ جی الانہ نے

اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ رتن بائی کو سال بھر بعد آزادانہ فیصلہ کرنے کے حق سے محروم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ خواہ وہ فیصلہ ان کے خلاف ہی کیوں نہیں پڑتا۔ یہ تو ذاتی محبت کی بات تھی۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک عدم سے اختلاف کرنے کا فیصلہ بالکل غیر جذباتی فیصلہ تھا۔ اصفہانی نے اپنی کتاب میں مولانا بھاشانی کے سلسلے میں اُن کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"کہ بیکار جذباتی باتوں اور رقیق القلبی کے لیے سیاست میں کوئی جگہ نہیں۔ سیاست شطرنج کی بازی ہے اور برائیوں کا مداوا آنسوؤں میں نہیں بلکہ محنت، جرأت اور عزم سے ہی ہو سکتا ہے۔ شدید سیاسی بحران کے زمانے میں دماغ کو ٹھنڈا اور آنکھوں کو خشک رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انسان صاف طور پر دیکھ سکے اور فیصلہ کر سکے"۔ برصغیر کی سیاست کا روایتی انداز اور لب و لہجہ جذباتیت کا رہا ہے۔ عوام کا مزاج بھی یہی ہے اس کے باوجود خود ان کی سیاست جذباتیت سے عاری تھی۔ وہ عوام کے سامنے سیاسی تقریروں میں بھی جذباتی ہونے کے بجائے اپنے نقطۂ نظر کو مدلل، واضح اور پُرجوش طریقے سے پیش کرتے تھے۔ عام لوگوں کو صرف خوش کرنے یا وقتی طور پر ہم خیال کرنے کے لیے جذباتی خطابت کے ہتھکنڈوں سے کام نہیں لیتے تھے۔ وکالت میں بھی ان کا انداز یہی تھا۔ جذباتیت سے بلند ہونا قائداعظم کی شخصیت کا ایک اہم عنصر تھا۔

قائداعظم کے کردار کی چوتھی اور سب سے اہم خصوصیت جو انہیں برصغیر کے تمام سیاست دانوں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے وہ ان کی دیانت

ہے۔ نفسیاتی بھی، ذاتی بھی، اخلاقی بھی اور سیاسی بھی۔ ہر سطح پر ان کی دیانت بے نظیر و بے مثال تھی۔ ان کی عظمت کا یہ ایک عجیب رُخ تھا کہ وہ فراست ہی میں نہیں دیانت میں بھی جواب نہیں رکھتے تھے۔ وہ ایک باضمیر انسان اور ایک باضمیر سیاست دان تھے لوگ محبت، جنگ اور سیاست میں سب کچھ جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے ہمعصر بھی ایسا ہی کرتے تھے لیکن وہ اِن میدانوں میں بھی جائز کو جائز ہی سمجھتے تھے ان کا واسطہ انگریز اور ہندو دو ایسی طاقتوں سے تھا جو کسی خانے بند نہیں تھیں لیکن قائدِاعظم پھر بھی سیاسی جنگ میں کبھی معیار سے نہیں اترے۔ جو سوچا وہ کہا جو صحیح سمجھا وہ کیا۔ جو وعدہ کیا پُورا کیا۔ بمبئی میں ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک تین سال تک کا عرصہ ان کے لیے بہت صبر آزما تھا۔ مقدمے تقریباً نہیں ملتے تھے۔ خرچ جاری تھے۔ خاندان کی کفالت بھی ان کے ذمّہ تھی۔ روپے کی اشد ضرورت تھی اس زمانے میں بعض دلالوں نے کمیشن پر مقدمے دلانے کی پیش کش کی۔ لیکن انہوں نے ان تجویزوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اصفہانی نے اپنی کتاب میں ان کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں۔ انہوں نے کہا ”میں بھوکا مرجانے کو اس طرح کی تجاویز قبول کرنے پر ترجیح دوں گا۔“

تحریک عدم تعاون کا زور توڑنے کے لیے حکومت ان کے تحریک عدم تعاون کے رہنماؤں سے اختلافات سے فائدہ اُٹھا کر انہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتی تھی۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے انہیں ججی، لا ممبری ہر کے خطاب غرض ہر قسم کے اعزاز کی پیش کش کی۔ انہوں نے ہر پیش کش کو مسترد کردیا۔

ریمزے میکڈانلڈ نے گورنری کا جال بھی ڈالا تھا۔ اس سے بڑی بات یہ کہ تحریک عدم تعاون سے عدم تعاون کر کے بھی انہوں نے حکومت سے تعاون نہیں کیا۔ ان کا اختلاف بھی اصولی ہوتا تھا۔ اتفاق بھی اصولی۔ جب وہ بمبئی کے مسلم حلقے سے انتخاب لڑ رہے تھے تو ان کے دو مخالفوں نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ ان سے اپنے حق میں بیٹھ جانے کے لیے کہیں رسماً ہی سہی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اور ووٹنگ جاری رہی۔ اصفہانی نے لکھا ہے کہ ۴۶ کے انتخاب میں کلکتے کی ایک اہم سیٹ کے لیے مخالف امیدوار نے زر ضمانت لے کر بیٹھ جانے کی پیش کش کی۔ چند سو روپوں کی بات تھی۔ عبدالرحمٰن صدیقی اور اصفہانی دونوں پیسے دینے پر راضی تھے۔ قائداعظم نے سُنا تو حکم دیا کہ انتخاب لڑا جائے اور مخالف امیدوار کی دستبرداری کو کسی قیمت پر نہ خریدا جائے۔ پیسوں کی نہیں اصول کی بات تھی۔ بعد کو انہوں نے اصفہانی سے کہا" بیٹا! سیاست میں اخلاقی دیانت نجی زندگی کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ اگر تم عوام کی زندگی میں کسی غلطی کے مرتکب ہو گے تو تم بہت زیادہ ایسے انسانوں کو نقصان پہنچاؤ گے۔ جو تم پر انحصار رکھتے ہیں"۔ اسی طرح کا ایک واقعہ جی الانہ نے بھی اپنی کتاب قائداعظم جناح میں لکھا ہے ۱۹۴۶ء میں سندھ میں صوبائی اسمبلی کے انتخاب ہو رہے تھے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی ساری سیٹیں جیتنا چاہتی تھی۔ اور یہ بہت اہم تھا ایک سیٹ سے مسلم لیگ کے امیدوار قاضی اکبر کا مقابلہ جی ایم سیّد کر رہے تھے انہیں ان کے اپنے مریدوں کے حلقے دادُو سے

ہرانا آسان کام نہیں تھا۔ قائداعظم بہت فکر مند تھے۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹے۔ ایک بات یاد رکھیے! اگرچہ انتخابات اہم ہیں تاہم انہیں جیتنے کے لیے نامناسب طریقے اختیار نہ کیے جائیں۔ مثال کے طور پر آپ کو جی ایم سید کے حلقے میں مسلم لیگ کے نمائندے قاضی اکبر کو ہر قیمت پر کامیاب کرانا ہے لیکن ووٹروں کو کسی قیمت کی رشوت نہیں دی جائے گی۔ یہ میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ ووٹ خریدنے کے لیے کسی ووٹر کو ایک روپیہ بھی دیا جائے۔ یہ بد دیانتی اور بے ایمانی ہے۔ میں اس بے ایمانی کے مقابلے میں ہار جانے کو ترجیح دوں گا۔" اس بیان پر جی الانہ کا تبصرہ یہ ہے: "حقیقت یہ ہے کہ یہ انکی عظمت کا ایک اہم عنصر تھا۔ انہیں یقین تھا کہ قیام پاکستان جیسے اعلیٰ مقصد میں صرف اخلاقی طریقوں ہی سے کامیابی ہو سکتی ہے۔ سیاست میں بھی اخلاقی اصولوں کو برتنے کا ایک واقعہ قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے۔ شہاب صاحب بحیثیت آئی سی ایس، سی پی میں ایک کانگریسی وزیر کے سیکرٹری تھے۔ کانگریسی وزیران پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ ایک بار انہوں نے کانگریس ہائی کمان کا ایک انتہائی خفیہ مراسلہ جو مسلمانوں کے خلاف تھا انکی تحویل میں دے دیا۔ شہاب صاحب کی قومی عصبیت نے انہیں مجبور کیا کہ دلی جا کر وہ دستاویز قائداعظم کو دکھائیں۔ قائداعظم نے کاغذات دیکھے۔ مسکرائے، شانہ تھپتھپایا اور پھر فرمایا:

"بحیثیت ایک مسلمان کے تم نے ایک ہندو کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر اچھا نہیں کیا"۔

یہ تھے قائداعظم، جس شخص نے پاکستان بنایا اس کی قدریں یہ تھیں۔ اور یہ کردار تھا ان کی ساری زندگی بڑائی کا ایک طویل دن تھی وہ زندگی کے ہر دور میں ہر مرحلے میں ہر منزل میں بڑے رہے اور یہ بڑائی بنیادی طور پر کردار کی بڑائی تھی وکالت میں، تحریر میں، تقریر میں، خلوص میں، قربانی میں، اجتماعی طور پر نہیں۔ فرداً فرداً تو ضرور ان کے حریف موجود تھے۔ لیکن سیاسی فراست فیصلہ کی قوت، ارادے کے عزم اور سب سے بڑھ کر اخلاقی جرأت اور دیانت میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ ان کے اندر قیادت کی وہ صفات بعینہٖ موجود تھیں جن کی مسلم قوم کو تاریخ کے اس موڑ پر سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ایک بڑے آدمی کی بڑائی پر سب سے معتبر گواہی دوسرے بڑے آدمی کی گواہی ہوتی ہے۔ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں اقبال نے قائداعظم کو لکھا۔

"مسلمانوں کو آپ کی قیادت کی ضرورت ہے آپ ہی انکی کشتی کے پتوار سنبھالیں۔"

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں کارکشا و کارساز

قائداعظم کی شخصیت کا مطالعہ

قائداعظم کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک سوال سب سے پہلے ذہن میں یہ ابھرتا ہے کہ قائداعظم کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اپنا قائداعظم کیسے تسلیم کر لیا ؟ ان پر اتنا مکمل اعتماد کیسے کر لیا۔ جب کہ برصغیر کے رہنماؤں کی روایتی خصوصیات ان کے اندر نہیں تھیں۔ مثلاً وہ روایتی معنوں میں مذہبی آدمی نہیں تھے۔ عقیدۃً اسماعیلی خوجے تھے جو مسلمانوں کی اکثریت کا عقیدہ نہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز شمالی ہند تھا۔ ان کا تعلق کاٹھیاواڑ بمبئی سے تھا۔ مسلمانوں کی خاصی زبان، اردو ان کی زبان نہیں تھی۔ رہنا سہنا ان کا عام مسلمانوں سے مختلف رہا تھا۔ مزاج کے اعتبار سے جذباتی وہ نہیں تھے۔ کم آمیز وہ تھے، پھر وہ اجتماعی امنگوں کا مرکز کیسے بنے ؟۔

یہ سوال بہت اہمیت رکھتا ہے اس سے مسلمانوں کے معیار قیادت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ عام مسلمان خود لاکھ معیار سے کم تر ہوں لیکن دل سے وہ اسی رہنما کی قیادت کے قائل ہوں گے۔ جو اپنی ذاتی زندگی میں کھرا ہو۔ جس کا کردار بے داغ ہو۔ جو دولت کی ہوس سے اور

نفس پرستی سے بلند ہو۔ جو کچھ شان درویشی بھی رکھتا ہو یا امارت کی صورت میں جس کا دل غنی ہو۔ عامۃ المسلمین خلوص اور بے لوثی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ قائداعظم میں یہ بنیادی صفت موجود تھی۔ نہ انہیں خریدا جا سکتا تھا نہ جھکایا جا سکتا تھا۔ مسلمانوں کو ان پر یہ اعتماد ایک روز میں نہیں ہوا۔ ۱۸۹۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کی ان کی پچاس سال کی نجی اور سیاسی زندگی ان کے سامنے تھی۔ ان کی وفاداری اور استواری کو ہر اعتبار سے مسلم قوم نے پرکھا اور برتا تھا۔

قائداعظم پر اعتماد کے معنی یہ تھے کہ مسلمان تمام فرقہ وارانہ، علاقائی، نسلی اور تنگ نظری کے مقبول تقاضوں سے بلند ہو کر صرف اصولی اور نظریاتی سطح پر سوچنا چاہتے ہیں۔ قائداعظم کی ذات میں مسلمانوں نے ایسی قیادت کو قبول کیا جو تمام تعصبات، ذاتی خواہشات، علاقائی و صوبائی یا فرقہ وارانہ ذہنیت سے بالا تھی اور یہ کوئی تعصب کی بات بھی نہیں تھی توحید پر ایمان رکھنے سے مسلمانوں کا لاشعوری رجحان تمام حد بندیوں سے اوپر اُٹھنے کی طرف ہوتا ہے پھر قائداعظم میں ایک اور ایسی صفت بھی تھی جو مسلمانوں کی تاریخ کے اس دور میں بے حد اہم ہو گئی تھی۔ یعنی ان کا تدبر اور سیاسی شعور، مشکل فیصلے کرنے کی صلاحیت اور ان کو بروئے کار لانے کا حوصلہ اور ہمت، ان کا غیر جذباتی مزاج بھی اس مرحلے پر کام آیا، ان کا مقابلہ دو چالاک، شاطر لیکن تنگ نظر اور تنگ دل اور تعصب سے لبریز دشمنوں سے تھا۔ وہ ان دونوں کے لئے دو دھاری تلوار

بن گئے تھے اور اقبال سمیت برصغیر کے مسلمانوں کو یقین ہو گیا تھا کہ اس منجدھار میں وہ مسلمانوں کی کشتی کے پتوار سنبھال سکتے ہیں ۔ یہ الفاظ بھی اقبال ہی کے ہیں . جو انہوں نے مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں قائداعظم کو لکھے تھے .
قیادت کے لیے صرف خلوص اور ایثار ہی کافی نہیں ہوتا اخلاق کے ساتھ کردار اور کردار کے ساتھ ذہن کی جودت و دراکی ضرورت بھی ہوتی ہے؟
قائداعظم ان صفات سے بھی متصف تھے .

ہیکٹر بولیتھو کی لکھی ہوئی قائداعظم کی سوانح عمری نے ایک غلط فہمی یہ پھیلائی ہے کہ قائداعظم سرد اور سخت گیر تھے ، اور ان میں انکسار کی کمی تھی ۔ ایک کرائے کا مصنف ایک قوم کے ہیرو کے ساتھ کیسے انصاف کر سکتا تھا ۔ ہیکٹر بولیتھو ان سے متاثر تو کیا ہوتا وہ تو ان سے براہ راست واقف بھی نہیں تھا ۔ بہرحال اس نے اپنی کتاب سے جو تاثر دیا وہ وہی ہے جو قائداعظم اور پاکستان کے مخالف ہندو اور برطانوی حلقے دیتے رہے ہیں .

حقیقت حال یہ ہے کہ قائداعظم بحیثیت مجموعی سنجیدہ دل و دماغ کے حامل تھے ۔ کم آمیز اور دیر آمیز، حساس لیکن غیر جذباتی ۔ ان کے دل، ان کے دماغ کی گرفت بہت مضبوط تھی ۔ جذباتیت ان کے اندر بالکل نہیں تھی . بظاہر وہ سرد ضرور نظر آتے تھے . لیکن یہ سرد مہری بھی بامقصد اور قوم کی خاطر تھی ۔ اصفہانی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ لیگ کونسل کے اجلاس کے دوران جب خواجہ ناظم الدین یکایک بیمار پڑ گئے تو وہ ان کو دیکھنے اسپتال نہیں گئے ۔ استفسار پر کہا اگر میں ایک رکن کو دیکھنے گیا تو ہر رکن کو دیکھنے جاؤں

گا۔ پھر قوم کا کام کب کروں گا۔" حقیقت میں عیادت کے لیے نہ جانا بھی اصول کی بات تھی اور قوم کی خدمت کی بھی۔ ویسے اس موقع پر بھی ان کی فراست کام آئی خواجہ صاحب کو دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ صرف بدہضمی کی شکایت ہو گئی تھی۔ دوسرے روز وہ بھلے چنگے تھے۔ جو لوگ انہیں دیکھنے گئے تھے انہوں نے بھی وقت ہی ضائع کیا تھا اب اس طرح کے واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ بے حس یا ہمدردی کے جذبات سے عاری تھے غلط ہو گا۔ بڑے آدمیوں کو عام جذبات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ سچی محبت شرک کو پسند نہیں کرتی۔ قوم کی محبت اور اصولوں کی محبت کے راستے میں ان کی اپنی بیوی اور بیٹی کی محبت بھی حائل نہ ہو سکی۔

تحریک پاکستان کے زمانے سے پاکستان دشمن عناصر بانیِ پاکستان کے خلاف جو پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ ان میں انانیت بہت تھی۔ عام لوگوں سے دور رہتے تھے اور شعار اسلامی سے بھی ان کی دلچسپی کم تھی۔

ان تینوں اعتراضوں کا جواب اس واقعہ میں ہے جو قائداعظم کے ایک معتمد کارکن اور نیشنل بنک آف پاکستان کے مینجنگ ڈائریکٹر اور ممتاز دانشور ممتاز حسن نے دسمبر ۱۹۵۴ء کے ماہِ نو میں بیان کیا وہ کہتے ہیں عام غریب مسلمان جناح کو کیا سمجھتے تھے مجھے اس کا اندازہ ۱۹۴۶ء میں ہوا جب جناح لندن کے مشرقی حصے کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں خالی کر دیں تاکہ وہ سب سے

اگلی صف میں بیٹھ سکیں۔ لیکن خود انہوں نے آخری صف میں بیٹھنا پسند فرمایا اور کہا میں دیر سے آیا ہوں۔ کسی اور جگہ کا مستحق نہیں نماز ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے اُنہیں گھیر لیا وہ قائداعظم کو قریب سے دیکھنا اور ان سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایسے بھی تھے جو اپنی چھوٹی چھوٹی کاپیوں میں ان کے دستخط لینا چاہتے تھے۔ اس کے بعد ہر نمازی نے ان سے مصافحہ کیا یہ خلوص اور عقیدت کا ایک بے مثال مظاہرہ تھا۔ ایک شخص پر رقت طاری ہو گئی اور اس نے دُعا مانگی کہ اے خُدا میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے۔ یہ سارے کا سارا مجمع غریب مسلمانوں کا تھا۔ کوئی ملاح تھا، کوئی چھوٹا دکاندار، کوئی خوانچہ فروش۔ قائداعظم کا ارشاد تھا کہ "میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں جو کسی فرقے سے خاص نہ ہو اور جس میں غریب مسلمان نماز پڑھتے ہوں"۔ اس واقعہ سے جو اپنی نوعیت کا تنہا نہیں۔ انکسار، غریبوں سے محبت، بے تعصبی اور شعار اسلام سے محبت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے ڈرائیور فقیر محمد کا بیان ہے کہ ان کے ذاتی خدمت گار نے اُسے بتایا کہ اکثر رات گئے صاحب نماز کے لیے سجدے میں ہوتے تھے۔

قائداعظم کی ظاہری سرد مہری اور سخت گیری بھی بے وجہ نہیں تھی۔ انسان ایک وقت میں ایک ہی چیز سے محبت کر سکتا ہے عام لوگ اپنی اور اپنوں کی ذات میں دلچسپی رکھتے ہیں اور ان سے جذباتی محبت کا اظہار کرتے ہیں لیکن کچھ غیر معمولی عظیم لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی اور دوسروں کی ذات سے وابستگی سے بلند ہو کر کسی عظیم نصب العین یا بلند مقصد سے

اپنی تمام دلچسپی تمام جذباتی اور ذہنی زندگی مربوط کر دیتے ہیں۔ ان کی محبت، ان کی نفرت، ان کا جینا ان کا مرنا اسی مقصد کے حوالے سے ہوتا ہے ان کی توجہ کا مکمل ارتکاز ایک نقطے پر ہو جاتا ہے۔ اس لیے سطحی نظر کو وہ غیر جذباتی نظر آتے ہیں۔ قائداعظم کی تمام جذباتی، ذہنی قوتیں ان کے قومی مشن میں اس طرح جذب ہو گئی تھیں کہ ان کے ذاتی احساسات اور جذبات نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اصولوں سے انحراف تو وہ نہ بیوی کی چاہت کے لیے کر سکتے تھے نہ بیٹی کی محبت کے لیے دوسرے تو دور کی بات ہوتے ہیں۔

بنیادی طور پر وہ حساس اور ہمدرد تھے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں قائداعظم کے پرسنل اسسٹنٹ فرخ امین نے اِن کے حساس اور انتہائی رحمدل ہونے کے بارے میں کتنی واقعے نوٹ کیے ہیں۔ فکر اور پریشانی کے ایسے موقعوں پر جب دوسرے اعصابیت کا شکار ہو جاتے ہیں وہ ظاہری سکون اور توازن کو قائم رکھتے تھے۔ تقسیم کے بعد مہاجروں کے شدید آلام اور مصائب سے اندرونی طور پر بے حد متاثر تھے۔ فرخ امین نے لکھا ہے میں نے ان دنوں انہیں دو ایک رات کی خاموشیوں میں سونے کے کمرے میں اضطراب کی حالت میں ٹہلتے دیکھا۔

قائداعظم کی شخصیت کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ غم و فکر محبت اور ہمدردی کے جذبات کا برملا اظہار کبھی نہیں کرتے تھے۔ منافقت ان میں نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ ان معاملات میں بھی کھرے تھے۔ جہاں منافقت کو مصلحت کا نام دیا جا سکتا تھا۔ ممتاز حسن نے لکھا ہے کہ جب تقسیم سے ذرا پہلے فرقہ وارانہ

کشیدگی بڑھنے لگی اور ہندو سکھوں نے بھاری مقدار میں اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ تو بعض لوگوں نے قائداعظم سے درخواست کی کہ مسلمانوں کو بھی مقابلے کے لیے ہتھیار اکٹھے کرنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ قائداعظم یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے "کہ کیا تم لوگ مجھے منافق سمجھتے ہو کہ ایک طرف تو صلح کی اپیل کروں اور دوسری طرف تمہارے لیے ہتھیاروں کا بندوبست کروں میں ہرگز کسی ایسی تحریک کی حمایت نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا غیر مسلموں کی طرف سے"

اس بے لاگ دیانت داری کا نتیجہ تھا کہ جائز سیاسی مقاصد کے لیے بھی وہ کسی کو پیسے دے کر اپنے ساتھ ملانے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ خواہ اس میں کتنا ہی بڑا سیاسی فائدہ مضمر ہو۔ ممتاز حسن ہی راوی ہیں کہ ۱۹۲۷ء میں مسلم لیگ میں موثر سیاسی کارکنوں کی سخت کمی محسوس کرتے ہوئے شملہ مسلم لیگ کے ایک رکن نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے ایک کانگریسی مسلمان ورکر کو توڑ کر مسلم لیگ کے لیے کام کرنے کے لیے آمادہ کیا وہ بہت اچھا مقرر بھی تھا اس سے مسلم لیگ کو بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اُس نے معاوضے میں صرف سو روپے ماہانہ طلب کیے۔ پوری صورتِ حال بتانے کے بعد قائداعظم کی اجازت طلب کی گئی۔ قائداعظم نے دو ٹوک جواب دیا۔ "دیکھو، تمہاری تجویز کو میں اس لیے منظور نہیں کر سکتا کہ یہ مسلمانوں کا اپنا کام ہے۔ اور اسے کرنے کے لیے کسی مسلمان کو کوئی رشوت دینا میرے نزدیک قطعاً ناجائز ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم ایک غریب قوم ہیں۔ اگر ہم

یہ رقم دے بھی دیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم سے زیادہ مالدار قوم اس سے زیادہ رقم دے کر اُسے نہیں خرید لے گی"۔ اس مثال سے ان کی دیانت ہی نہیں فراست اور اصول پرستی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ قائداعظم نے یہ بھی بتا دیا کہ پاکستانی سیاست کا اصل اصول کیا ہونا چاہیے۔

بعض اوقات انسان کی بڑائی کا اندازہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہوتا ہے۔ ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب "قائداعظم میری نظر میں" لکھا کہ جب وہ ان کے گھر کلکتے میں ٹھہرے تھے تو غیر ضروری بتیوں کو گل کر دیتے تھے اور ایسا کئی بار ہوا۔ اصفہانی نے کہا "آپ یہ زحمت کیوں کرتے ہیں" تو ان کا جواب تھا " روپے کو ضائع کرنا گناہ ہے اور اگر روپیہ عوام کا ہو تو اور بھی بڑا گناہ ہے"۔ پاکستان بننے کے بعد ایوانِ صدر میں بھی اکثر غیر ضروری روشنیوں کو گل کرتے دیکھے گئے۔ اصفہانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ تحریک پاکستان کے سلسلے میں جو منی آرڈر آتے تھے ان کی دو آنے چار آنے والی رسیدوں پر بھی وہ خود دستخط کرتے تھے۔ نیاز مندوں کے عرض کرنے پر کہ یہ خدمت کسی اور کے سپرد کی جائے چونکہ اس میں ان کا قیمتی وقت صرف ہوتا ہے انہوں نے جواب دیا " بات رقم کی مقدار کی نہیں جذبے اور اصول کی ہے۔ جتنا جس کے پاس ہے وہ پاکستان کے لیے دے رہا ہے میں خود دستخط کر کے اس کے جذبے کی قدر کرنا چاہتا ہوں اور اس کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس کا پیسہ پیسہ میرے علم میں ہے اور محفوظ ہے"۔ وہ قومی پیسے کے بارے میں غیر معمولی طور پر محتاط تھے جو کارکن پیسے کے حساب رکھنے

میں کوتاہی کرتا یا لاپرواہی سے صرف کرتا خواہ اس طرح نقصان زیادہ نہ بھی ہوا ہو۔ لیکن اس پر کسی اور معاملے میں بھی اعتبار نہیں کرتے تھے۔

قائداعظم محض کسی کو خوش کرنے کے لیے خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو یا محض عوام کو متاثر کرنے کے لیے نہ کچھ کہہ سکتے تھے نہ کر سکتے تھے۔ ان کی دوستی اور دشمنی برملا ہوتی تھی اور اصول کی خاطر ہوتی تھی۔ نہ وہ بک سکتے تھے ان کی سخت گیری ان کی انتہائی دیانت کا ایک ظاہری پہلو تھا۔

جب کبھی ان کی دیانت داری کی تعریف کی جاتی تھی تو وہ کہتے تھے میرے نزدیک یہ بالکل فطری بات ہے۔ اصفہانی نے لکھا ہے ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اُن کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔ کھانا۔ آرام۔ نیند سب کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

دور سے وہ ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند نظر آتے تھے۔ جذبات کے لیے ان کے پاس زیادہ وقت نہ تھا اصل میں ان کی حالت اس جان باز سپاہی کی سی تھی جسے میدان جنگ میں لڑنے کے سوا نہ کسی چیز کا ہوش ہوتا ہے نہ ضرورت ہوتی ہے۔ قائداعظم پر اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

؎ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو بزم ہو، پاک دل و پاک باز

خوش مزاجی اور حاضر جوابی

بنیادی طور پر قائداعظم سنجیدہ دل و دماغ کے آدمی تھے۔ ان کے مشاغل اور دلچسپیاں بھی سنجیدہ نوعیت کی تھیں۔ ان کے بارے میں عام تاثر بھی یہی ہے کہ وہ بے حد سنجیدہ اور متین انسان ہیں۔ سنجیدہ اور متین وہ ضرور تھے لیکن ان کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مناسب اور موزون موقعوں پر وہ وقار سے ہنستے ہنساتے بھی تھے۔ سلجھے ہوئے مذاق سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ خود بھی کبھی کبھی دلچسپ واقعات اور لطیفے سناتے تھے۔ ابوالحسن اصفہانی اور ممتاز حسن جنہیں قائداعظم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ فرخ امین جو آخری ایک برس ان کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے تھے، ان سب نے قائداعظم کی خوش مزاجی کا تذکرہ کیا ہے۔ فرخ امین نے قائداعظم کا سنایا ہوا ایک لطیفہ بھی لکھا ہے۔ "اگر وہ نہیں ہو تو ویسے نظر کیوں آتے ہو"۔ پورا لطیفہ یوں ہے کہ انگلستان کے ایک چھوٹے سے سٹیشن پر گاڑی معمول سے زیادہ دیر ٹھہر گئی ایک ہندوستانی جج نیچے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے اتنے میں ایک انگریز بھی گاڑی سے اترا اور سیدھا جج صاحب کے پاس جاکر پوچھنے لگا گاڑی کب چلے گی۔ جج نے کہا مجھے کیا معلوم۔ اس پر انگریز نے کہا تمہیں معلوم ہونا چاہیے کیا تم اسٹیشن ماسٹر نہیں ہو، جج نے

جھنجھلا کر جواب دیا نہیں ۔ میں اسٹیشن ماسٹر نہیں ہوں ۔ انگریز بولا اگر نہیں ہو تو ویسے نظر کیوں آتے ہو؟

ایک مرتبہ قائداعظم لاہور میں اپنے ایک عزیز دوست اور مقتدر لیگی رہنما ملک برکت علی کے ہاں شادی کی ایک تقریب میں شریک تھے ۔ کھانے کے بعد جو فیرنی پیش کی گئی اس میں غلطی سے چینی کے بجائے نمک ملا ہوا تھا ۔ جو مہمان فیرنی کا چمچہ منہ میں ڈالتا ۔ منہ بناتا ۔ میزبان پریشان اور شرمندہ تھے ۔ قائداعظم میزبان کے آڑے آئے فوراً اپنی جگہ سے اُٹھے اور مہمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا "حضرات نمکین فیرنی پر متعجب نہ ہوں ملک صاحب آپ کو اپنے گھر کا زیادہ سے زیادہ نمک کھلانا چاہتے ہیں تاکہ آپ ان کا نمک حلال کر سکیں"۔

لیکن ان کی ظرافت اور حاضر جوابی حریفوں کے لیے طنز کی تلوار بن جاتی تھی ۔

ایک دفعہ کسی مقدمے میں بحث لمبی ہو گئی ۔ قائداعظم کی عادت تھی کہ وہ تفصیل سے پورا تجزیہ کرتے تھے ۔ انگریز مجسٹریٹ جھنجھلایا ہوا تھا چمک کر بولا ۔ مسٹر جناح میں آپ کی باتوں کو ایک کان سے سنتا ہوں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں ۔ قائداعظم نے برجستہ جواب دیا "

"جناب والا" آپ کے دونوں کانوں کے درمیان کی جگہ غالباً خالی ہے"

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ قائداعظم ایک مقدمے میں بڑے اعتماد اور قدرے جارحانہ انداز سے اپنے دلائل پیش کر رہے تھے ۔ انگریز

مجسٹریٹ کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی۔ بھڑک اٹھا۔ تنبیہ کے لہجے میں بولا "مسٹر جناح نہ بھولئے آپ کسی تھرڈ کلاس مجسٹریٹ سے مخاطب نہیں ہیں" قائداعظم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "جناب والا۔ آپ کے سامنے بھی کوئی تھرڈ کلاس وکیل بحث نہیں کر رہا ہے"۔

ایک اور مقدمے میں ایک بر خود غلط جج نے کہا "مسٹر جناح زور زور سے بولیئے میں سن نہیں رہا" قائداعظم نے کہا "غور سے سننا آپ کا کام ہے میں بیرسٹر ہوں ایکٹر نہیں ہوں"۔ لیکن قائداعظم کی اس حاضر جوابی اور طنز کے اصلی جوہر سیاسی میدان میں کھلتے تھے جب وہ اپنی برجستہ گوئی اور طنز کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔

کانگریسی لیڈر موہن داس کرم چند گاندھی نے مہاتما کا روپ دھار رکھا تھا اور مہاتما گاندھی کے نام سے معروف تھے ان کے روحانی کمالات کا بھی ہندوؤں میں بڑا چرچا تھا یوں تو وہ تمام ہندوستانیوں کا لیڈر ہونے کا دم بھرتے تھے لیکن اندر سے خالص ہندو تھے اور ہندو مفادات کے کٹر محافظ۔ قائداعظم گاندھی کی منافقت کا حال جانتے تھے۔ ان کی رُوحانی کرامتوں کے قصوں سے بھی وہ مرعوب نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ بھی سیاسی ہتھکنڈے ہیں۔ دونوں سیاست کے میدان میں ایک دوسرے کے حریف تھے اور دونوں میں نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

ایک دفعہ گاندھی کے کسی چیلے نے اخبارات کو خبر مہیا کی کہ کل شام مہاتما جی اپنے آشرم کی کٹیا میں پرارتھنا کر رہے تھے کہ باہر سے ایک بڑا سانپ کٹیا

میں آ گیا۔ مہاتما جی نہ اس سے ڈرے نہ انہوں نے اس کی پرواہ کی۔ برابر پرارتھنا میں محو رہے۔ سانپ نے مہاتما جی کے گرد ایک دو دفعہ چکر لگاتے اور جیسے چپکے سے کٹیا میں داخل ہوا تھا۔ اسی طرح خاموشی سے باہر چلا گیا"۔ بس پھر کیا تھا۔ کانگریسی حلقوں، ہندو جاتی اور نیشنل پریس نے مہاتما گاندھی کی کرامت کے طور پر اس خبر کی خوب تشہیر کی۔ وقت بے وقت، کوچہ و بازار میں عام جلسوں اور نجی محفلوں میں اس کے چرچے ہونے لگے۔

اس دوران ایک پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں نے قائداعظم سے پوچھا "قائداعظم آپ نے سانپ اور گاندھی جی کی خبر اخبارات میں پڑھی ہے"۔ آپ نے فرمایا "ہاں پڑھی ہے"۔ صحافیوں نے سوال کیا "آپ کا کیا خیال ہے یہ حقیقت ہو سکتی ہے یا محض پراپیگنڈہ ہے"؟ جواب ملا "ایسا ہونا ممکن ہے اور ہو سکتا ہے یہ بات صحیح ہو" ایک من چلے رپورٹر نے پوچھ لیا "قائداعظم تو سانپ کے اس طرز عمل کی آپ کیا توجیہہ کریں گے"؟

قائداعظم مسکرائے۔ آنکھوں میں ظرافت کی چمک پیدا ہوئی اور کہا:۔
" PROFESSIONAL ETIQUETTE پیشہ وارانہ اخلاق کی بات ہے"
(زہریلے کیڑے اپنے جیسے زہریلے جاندار کو نہیں ڈسا کرتے) اس سیاسی طنز کا جواب نہیں۔ جو لوگ گاندھی کی سیاسی چالوں سے واقف ہیں وہی اس کی داد دے سکتے ہیں۔

جون ۱۹۳۷ء میں قائداعظم پنجاب مسلم لیگ کا پارلیمانی بورڈ قائم کرنے لاہور تشریف لائے اس وقت مسلم لیگ بالکل منظم نہیں تھی اور صوبے پر

یونینسٹ پارٹی چھائی ہوئی تھی۔ قائداعظم کی ٹرین رات کو پہنچی۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ جیسے ہی قائداعظم نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ سارے ریلوے اسٹیشن کی لائٹ آف ہوگئی اتفاقاً یا کسی کی شرارت تھی۔ مجلس استقبالیہ کے اراکین گھبرا گئے۔ قائداعظم نے اپنی گرجدار آواز میں برجستہ فرمایا۔" دیکھا۔ لاہور میں میرے قدم رکھتے ہی یونینسٹ پارٹی کا چراغ گل ہوگیا"۔

۵ اگست ۱۹۴۷ء کو دہلی سے کراچی روانہ ہونے سے پہلے قائداعظم نے جو پریس کانفرنس بلائی تھی اس میں ہندو صحافی مخالفانہ انداز سے سوال وجواب کر رہے تھے ایک نے پوچھا "پاکستان کیا مذہبی ریاست ہوگی؟ قائداعظم نے جوابی سوال کیا۔"مذہبی ریاست کا کیا مطلب ہے"؟ بغیر سوچے سوال نہیں کرنا چاہیئے"۔ اس پر ایک تیز ہندو صحافی نے اپنے خیال میں تیر مارا۔"اس کا مطلب ہے ملاؤں کی حکومت"۔ قائداعظم نے برجستہ جواب دیا۔"پنڈتوں کی حکومت کے بارے میں کیا خیال ہے"؟ (اشارہ پنڈت نہرو کی طرف تھا) اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا)

۱۹۴۶ء میں قائداعظم اہم سیاسی مذاکرات کے لیے لندن تشریف لے گئے قائداعظم پر سب کی نظریں لگی ہوئی تھیں لیکن وہ قبل از وقت کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے جہاز سے اترتے ہی اخبار لندن ٹائمز کے رپورٹر نے گھیرا۔"جناب آپ کیا پیغام لاتے ہیں"۔ مقصد یہ تھا کہ قائداعظم کے رویے کا کچھ کھوج لگایا جائے۔ اس روز اتفاق سے لندن کا مطلع صاف تھا۔ قائداعظم نے فوراً جواب دیا۔"میں آپ کے لیے خوشگوار موسم لایا ہوں"۔ پھر جائے قیام پر روانہ ہونے

سے پہلے کار کے پاس ذرا کے ذرا ٹھہرے پیچھے مڑ کر دیکھا اخباری نمائندے بیان لینے جھپٹے۔ قائداعظم نے مسکرا کر فرمایا۔ "دوستو آج جو بیان مجھے دینا ہے وہ یہی ہے کہ فی الحال میں کوئی بیان نہیں دوں گا" یہ کہہ کر کار میں سوار ہو گئے۔

قائداعظم کی حاضر جوابی اور نکتہ سنجی کا ایک واقعہ سردار عبدالرب نشتر نے لکھا ہے، ایک میٹنگ میں پاکستان کا پرچم زیر بحث تھا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ یہ بہتر نہ ہوگا کہ پاکستان کے پانچ صوبوں کی نمائندگی کے لیے پرچم میں پانچ ستارے رکھے جائیں۔ اس کے جواب میں سردار نشتر نے کہا پاکستان کے ساتھ ریاستوں کے الحاق اور کئی وجوہ سے صوبوں کی تعداد میں کمی بیشی کا امکان ہے۔ اس صورت میں ستاروں کی تعداد بدلنا ہوگی اور نہ بدلی تو پانچ ستارے بے معنی ہو جائیں گے۔ اس پر قائداعظم نے مسکرا کر فرمایا ایسی صورت میں ہم پانچ ستاروں کی توجیہہ کریں گے کہ ان سے مراد پنجتن ہے۔

قائداعظم کا یہ جواب ان کی حاضر جوابی کی مثال بھی ہے اور نکتہ سنجی کی بھی۔ اس سے ان کی ان کے لاشعوری ذہن کے مذہبی رجحان کا پتہ بھی چلتا ہے۔

قائداعظم کی ازدواجی زندگی

ہر بڑے آدمی کے بارے میں تجسس ہوتا ہے کہ دنیا کے اسٹیج پہ جیسا کچھ ہے، وہ تو ہے۔ اسٹیج کے پیچھے وہ کیسا ہے۔ اس کی گھریلو زندگی کیسی ہے۔ بیوی بچوں کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ اس کی نجی اور جذباتی زندگی کا رنگ کیا ہے۔ قائداعظم کے بارے میں بھی یہی تجسس ہے اور شدت سے

ہے۔ چونکہ اس سلسلے میں معلومات کم ہیں۔ اس لیے حقیقت کے ساتھ کچھ افسانے بھی مشہور ہو گئے ہیں۔

اب تک اس بارے میں جو کچھ تحقیق ہوئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

قائداعظم نے زندگی میں دو بار شادی کی ان کی پہلی شادی ۱۶ سال کی عمر میں لندن جانے سے ایک سال پہلے طالب علمی کے زمانے میں، ۱۸۹۲ء میں بمبئی کے مشہور تاجر لیرا کھیم کی بیٹی ایمی یا امر بائی سے ہوئی تھی۔ بہت دھوم دھام سے بارات کراچی سے ہریانہ جام نگر کاٹھیاواڑ گئی تھی اور شادی کی رسومات روایتی طریقے سے سرانجام پائی تھیں۔ کم عمری کی یہ شادی ان کی ماں کے اصرار سے ہوئی تھی۔ جو ان کے لندن جانے سے پہلے ان کے سہرے کے پھول دیکھنا چاہتی تھیں۔ شادی کے تقریباً ایک سال بعد جنوری ۱۸۹۳ء میں وہ کاروباری سلسلے میں لندن چلے گئے۔ وہاں پھر قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ ایک روایت کے مطابق ایمی بائی کا انتقال ۱۸۹۳ء میں ہو گیا دوسری روایت یہ ہے کہ وہ ۱۸۹۷ء میں بمبئی میں ایک وبا میں اللہ کو پیاری ہوئیں ایمی بائی سے اِن کی شادی ایک رسمی کارروائی تھی۔ اصل میں اس وقت دونوں بہت چھوٹے تھے۔

محمد علی جناح کی دوسری شادی ۱۹ اپریل ۱۹۱۸ء کو بمبئی میں رتن بائی سے ہوئی۔ دیکھا جائے تو یہ ان کی اصل شادی تھی۔ رتی بمبئی کے مشہور پارسی رہنما سر ڈنشا پیٹیٹ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ وہ ۲۰ فروری ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کی پرورش بڑے شاعرانہ ماحول میں ہوئی۔ رتی کی گیارہویں سالگرہ پر

سرڈنشا نے اپنی بیٹی کو مشہور انگریزی شاعر ٹینی سن کی نظموں کا مجموعہ تحفے میں دیا تھا۔ رتی کو ناول، ڈرامے سارے ادب کے مطالعہ کا شوق تھا خاص طور پر وہ انگریزی رومانی شاعری کی دلدادہ تھیں۔ جب ۱۶ سال کی عمر میں وہ محمد علی جناح سے ملیں تو انگریزی کے رومانوی شاعروں جیسے شیلے، کیٹس اور بائرن، کو اچھی طرح پڑھ چکی تھیں اور اسی شاعرانہ رومانی موڈ میں تھیں۔ نفیس، روشن دماغ اور شاندار جناح ان کے لیے ایک رومانی ہیرو سے کم نہیں تھے پھر ان کی ملاقات بھی رومانی ماحول میں ہوئی۔ سرڈنشا اور لیڈی دین بائی ڈنشا دونوں محمد علی جناح کے بڑے مداح اور قدر دان تھے۔ ان کی قابلیت، شخصیت کے بھی اور قوم پرستانہ خیالات کے بھی۔ جناح گرمیوں کی چھٹیاں سرڈنشا کی دعوت پر ان کے ساتھ بنگال کے مشہور پہاڑی مقام دارجلنگ پر گذار رہے تھے۔ دارجلنگ کی رومانی فضا میں ان کی ملاقات ہوئی دونوں کی شخصیت میں کچھ باتیں مشترک تھیں۔ مثلاً ذہانت اور فراست کے ساتھ دونوں ایک انفرادیت رکھتے تھے دونوں انسان دوست تھے سوشل ورک کے دلدادہ تھے۔ اور سیاست میں لبرل خیالات رکھتے تھے۔ بنیادی طور پر یہ شخصیت کا حسن تھا۔ جس نے ایک کو دوسرے کی طرف کھینچا۔ ظاہری حسن میں دونوں کے لیے کوئی کمی نہیں تھی۔ جناح اس وقت چالیس کے ہو رہے تھے اگر چاہتے تو بہت پہلے شادی کر چکے ہوتے۔ رتی کی عمر ۱۶ برس سے کچھ ہی زائد کی تھی جناح وجیہہ و شکیل ضرور تھے لیکن کشش کی اصل وجہ وجاہت و جمال نہیں

شخصیت کا جلال و جمال تھا۔

ایک دوسرے کو پسند کرنے کے بعد جناح نے سر ڈنشا سے جس طرح شادی کا ذکر چھیڑا وہ انکی منطقی طبعیت کی عجیب دلچسپ مثال ہے۔ انہوں نے سر ڈنشا سے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ دو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں شادی بیاہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ سر ڈنشا نے پُر زور طریقے سے ایسی شادیوں کی حمایت کی، کہنے لگے "قومی اتحاد حاصل کرنے کے لیے یہ ایک موثر ذریعہ ہے۔ بہت اچھی بات ہے ضرور ہونا چاہیے"۔ یہ سن کر جناح نے سنجیدگی سے کہا "تو اجازت دیجئے۔ میں آپ کی بیٹی رتی بائی سے شادی کرنے لگا ہوں"۔ سر ڈنشا سناٹے میں آگئے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ان کی اپنی رائے ان کے یوں گلے پڑے گی۔ سر ڈنشا بڑے تعلیم یافتہ اور آزاد خیال پارسی تھے۔ اور جناح کے خیالات اور شخصیت کے بڑے مداح۔ پھر بھی وہ اس رشتے پر تیار نہیں ہوئے۔ جب رتی نے اصرار کیا تو انہوں نے قانون کا سہارا لیا قانوناً رتی ۱۸ سال کی عمر سے پہلے اپنے والدین کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے عدالت سے حکم امتناعی حاصل کر لیا۔ رتی بے چین تھیں لیکن جناح تو جناح تھے انہوں نے کہا "قانون سر ڈنشا کے ساتھ ہے قانون کا احترام ضروری ہے ہمیں دو سال انتظار کرنا چاہیے"۔ چنانچہ دو سال تک دونوں ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ جناح نے اپنے وعدے کا پورا پاس کیا اور معاہدے کی پوری پابندی کی۔ رتی بائی کو پورا موقع دیا کہ وہ اپنے ارادے کو بدلنا چاہیں

تو بدل دیں۔ محبت کو عقل و اصول کے تابع رکھنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل فرا ہوتا ہے۔ لیکن جناح نے اس مشکل کو بھی آسان کیا۔

رتی بھی دھن کی پکی تھیں۔ یہاں بھی اصول کی بات تھی۔ ۱۸ برس کے ہوتے ہی انہوں نے والدین کو بتا دیا کہ میں اب بھی اپنے فیصلے پر قائم ہوں۔ ۱۸ اپریل ۱۹۱۸ء کو انہوں نے جامع مسجد بمبئی میں جاکر بارضاد رغبت اسلام قبول کر لیا ان کا اسلامی نام رتن بائی قرار پایا۔ بمبئی کے ۱۹ اپریل کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی اسی دن بمبئی ۱۹ اپریل ۱۹۱۸ء کو ان کا نکاح قائداعظم سے اسلامی طریقے سے ایک اثنا عشری قاضی نے پڑھایا۔ شیخ نجفی اور میرزا محمد علی مہاراجہ آف محمود آباد قائداعظم کی طرف سے گواہ تھے۔ رتن بائی کی طرف سے شریف دیوجی اور غلام علی گواہ تھے۔ مہر ۱۰۰۱ روپے تھا رونمائی یا نذرانے کے سوا لاکھ روپے۔ ہنی مون کا زمانہ انہوں نے یوپی کے مشہور پہاڑی مقام نینی تال میں گزارا تھا۔

رتن بائی جناح کی خلوت وجلوت کی ساتھی تھیں۔ ان کی سماجی ہی نہیں ان کی سیاسی مصروفیات میں بھی ان کے شانہ بشانہ کام کرتی تھیں۔ لارڈ ولنگڈن بمبئی کا برخود غلط اور بدترین سامراجی ذہنیت کا گورنر تھا اس نے ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں لیگ اور کانگرس کا مشترکہ اجلاس نہیں ہونے دیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں گورنمنٹ ہاؤس کی ایک دعوت میں لیڈی ولنگڈن نے مسز جناح رتن بائی کے ساتھ بے ادبی کا رویہ روا رکھا تھا اور جناح اپنی بیگم کے ساتھ احتجاجاً دعوت سے اُٹھ کر چلے آتے تھے۔ جب اسی ولنگڈن کو

کارپوریشن نے شہریوں کی طرف سے ۱۰ دسمبر ۱۹۱۸ء کو الوداعی سپاسنامہ پیش کرنے کی تجویز پیش کی تو جناح نے دوسرے قوم پرستوں کے ساتھ اس تجویز کی زبردست مخالفت کی۔ ٹاؤن ہال پر قبضہ کر لیا۔ پولیس سے اچھی خاصی مڈبھیڑ ہوئی اس ہنگامے میں رتن بائی بڑی جرأت سے اپنے دلیر شوہر کے ساتھ ساتھ رہیں۔ یہاں تک کہ پولیس سے تصادم سے دونوں کے خراشیں بھی آئیں۔ رتن بائی جرأت کے ساتھ ساتھ فہم و فراست اور حاضر دماغی میں بھی کم نہیں تھیں۔

جناح امپریل کونسل کے رکن کی حیثیت سے دلی آئے تھے۔ مسز رتی جناح ان کے ساتھ تھیں۔ وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے دونوں کو دوسرے معزز مہمانوں کے ساتھ رات کے کھانے پر دعوت دی۔ اس زمانے کے آداب کے مطابق اے ڈی سی نے وائسرائے اور لیڈی چیمسفورڈ کے آنے کا اعلان کیا تو مہمان تعظیماً کھڑے ہو گئے ہر مہمان اٹھ کر میزبان تک جاتا اور اس کا تعارف کرایا جاتا اور تمام خواتین رواج باری باری لیڈی چیمسفورڈ کے سامنے تعظیم کے طور پر سر خم کرتیں۔ جب مسز جناح کا وائسرائے اور لیڈی چیمسفورڈ سے تعارف کرایا گیا تو مسز جناح نے مسلم خواتین کی طرح لیڈی چیمسفورڈ کی خدمت میں آداب عرض کیا اے ڈی سی دم بخود رہ گیا۔ وائسرائے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن اس وقت درگذر کر گیا۔ کھانے کے بعد گفتگو کا دور شروع ہوا تو وائسرائے نے مسز رتی جناح سے کہا آپ کے شوہر کا مستقبل بہت شاندار ہے آپ کو ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بننا چاہیے۔ آپ نے قصر وائسرائے کے آداب کے مطابق ہماری تعظیم نہیں

کی۔ روم میں روم کے آداب ملحوظ رکھنے چاہیئں۔مسز جناح اس انداز گفتگو سے قطعاً متاثر نہیں ہوئیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے وائسرائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ یور ایکسی لینسی میں نے جملہ آداب کو ملحوظ رکھا ہے۔آپ ہندوستان میں ہیں اور میں نے ایک ہندوستانی خاتون کی طرح آپ کو تعظیم دی ہے۔
مسز جناح کا یہ جواب ان کے اور ان کے شوہر جناح کے شایان شان تھا۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف جناح سخت احتجاج کرکے کونسل سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ حکومت انہیں بائیں بازو کے انتہا پسندوں میں شمار کرتی تھی۔ جو ہوم رول سے کم کوئی چیز قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ جب تحریک عدم تعاون سے انھوں نے تعاون نہیں کیا۔ تو حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آگئی کہ کسی طرح انہیں رام کیا جائے۔ لارڈ چیمسفورڈ کے برخلاف وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ جناح کے بڑے مداح تھے۔ ان کی ذات کے بھی اور ان کی صفات کے بھی لارڈ ریڈنگ نے انہیں ترغیب دی کہ وہ ہائی کورٹ کے جج کا عہدہ قبول کرلیں، اس کے بعد وائسرائے کی کابینہ میں لا ممبر کی حیثیت سے تقرر کی پیش کش کی۔ جناح نے دونوں پیشکشیں مسترد کردیں۔
آخرکار سر کے خطاب کا جال بھی ڈالا۔ جناح نے جواب دیا "سر محمد علی جناح کے مقابلے میں، میں یہ زیادہ پسند کروں گا کہ مجھے صرف مسٹر محمد علی جناح کہا جائے"۔ مسٹر جناح سے مایوس ہو کر لارڈ ریڈنگ نے مسز جناح کو زیر دام لانا چاہا۔ ایک تقریب کے موقعہ پر لارڈ ریڈنگ نے مسز جناح سے پوچھا کیا وہ پسند نہیں کریں گے کہ لوگ اُنہیں لیڈی جناح کہیں ؟ مسز جناح نے

بے ساختہ جواب دیا اگر جناح نے سر کا خطاب قبول کر لیا تو میں ان سے الگ ہو جاؤں گی۔

خودداری اور قومی حمیت میں وہ اپنے عظیم المرتبت شوہر سے کم تر نہیں تھیں۔ اسی طرح وطن پرستی اور جرأت اظہار میں بھی مسز جناح کا جواب نہیں تھا۔ ایک اور موقع پر کھانے کی دعوت میں وہ لارڈ ریڈنگ کے پاس بیٹھی تھیں۔ ریڈنگ نے اپنے زندگی کے واقعات سناتے سناتے جنگ سے پہلے جرمنی میں اپنے زمانہ طالب علمی کے واقعات کا تذکرہ کیا اور کہا کہ یہ سوچ کر کتنا دکھ ہوتا ہے کہ اب میں خواہش کے باوجود جرمنی نہیں جاسکتا۔ مسز جناح نے پوچھا "آخر کیوں نہیں۔ یور ایکسی لینسی ؟" وائسرائے نے جواب دیا "بات یہ ہے کہ جرمن ہم انگریزوں کو خاص طور پر جنگ کے بعد پسند نہیں کریں گے" یہ سن کر مسز جناح نے برجستہ کہا۔ تو پھر" یور ایکسی لینسی آپ ہندوستان کیسے آگئے۔" یہ ان کی شخصیت کا جلالی پہلو تھا۔ ہمدردی و غم گساری سے بھی ان کا دل لبریز تھا۔ جی الانہ نے اپنی کتاب قائداعظم جناح میں ان کی نرم دلی اور انسانی ہمدردی کی مثالیں دی ہیں۔

۴ مئی ۱۹۱۹ء میں جب جناح ایک سیاسی مہم پر لندن گئے تو رتن بائی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ ۱۴۔ اگست ۱۹۱۹ء کو لندن میں ان کی اکلوتی بیٹی دینا پیدا ہوئیں۔ باقی لندن کے قیام کے زمانے میں رتن بائی کی خط و کتابت گاندھی اور کانجی دوارکا داس سے تھی اس سے ان کی سیاسی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے ناگپور کے اجلاس میں جناح نے گاندھی اور کانگریس سے کھل کر اختلاف کیا اس موقع پر بھی رتن بائی جناح

کے ساتھ تھیں۔

رتن بائی کے حسن "خوش لباسی"، بیش قیمت زیورات اور ذہانت خود اعتمادی کی وجہ سے انگریز حکمرانوں کی بیویاں ان سے حسد کرتی تھیں۔ لیڈی ولنگڈن کا واقعہ اُوپر گزرا۔ ۱۹۲۱ء کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے ان سے مل کر جو خطوط لندن لکھے ہیں ان میں ان کی خوبصورتی، خوش لباسی، جواہرات اور خود اعتمادی کا بار بار تذکرہ کیا ہے خوبصورتی، خوش ادائی، خوش لباسی، رتن بائی کی شخصیت کا صرف ظاہری پہلو تھا۔ وہ اپنے حسن کی وجہ سے بمبئی کا گلاب کہلاتی ہیں۔ اندر سے ان کی شخصیت بہت پہلو دار تھی۔ شاعری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مطالعے کی بے حد شوقین تھیں۔ ۱۹۲۰ء سے بعد کے زمانے میں رومانیات اور علم النجوم سے انہیں گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔ خود بھی بہت سے جانور پال رکھے تھے اور بیمار اور معذور پالتو جانوروں کی دیکھ بھال میں بہت دلچسپی لیتی تھیں اور ایسے اداروں سے بہت تعاون کرتی تھیں۔ کانجی دوارکا داس بمبئی کے ایک مشہور سوشل ورکر تھے۔ ان کے کام میں جناح اور مسز جناح دونوں علمی دلچسپی لیتے تھے۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۸ء تک دس سال دونوں نے بحیثیت مجموعی مثالی ہم آہنگی سے گزارے۔ اسمبلی، کورٹ، سیاسی پلیٹ فارم ہر جگہ دونوں ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ گرمیوں کی تعطیلات دونوں پہاڑی مقامات پر گزارتے تھے نارمل اختلافات تو ایک آدھ بار ان میں پہلے بھی ہوتے تھے لیکن جنوری ۱۹۲۸ء میں کچھ زیادہ ہی سرگرانی بڑھ گئی۔

اور رتی علیحدہ رہنے لگیں ۔ ۳۰ اپریل کو جناح انگلستان روانہ ہوئے ایک ہفتے کے بعد ۱۰ اپریل کو رتی بھی اپنی والدہ کے ساتھ روانہ ہو گئیں۔ پیرس میں شدید بیمار پڑ گئیں ۔ ایک مشترک دوست کے توسط سے جناح کو ان کی بیماری کی اطلاع ہوئی اس وقت وہ ڈبلن میں تھے وہ بھاگم بھاگ پیرس پہنچے ۔ کلینک میں رتی کی تیمارداری کی ۔ علاج تبدیل کروایا وہ ایک ماہ تک نرسنگ ہوم میں ان کے ساتھ رہے بہت محبت اور شفقت سے ان کی تیمار داری کی وہ ان کے ساتھ ہی پرہیزی کھانا کھاتے تھے ۔ یہ بات خود رتن بائی نے کانجی دوارکا داس کو ایک خط میں لکھی ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اختلافات ختم نہ ہو سکے ۔ وہ علیحدہ علیحدہ ہندوستان واپس ہوئے رتی نے ماں کے ساتھ دوسرا جہاز لیا ۔ لیکن جناح کی پر خلوص تیمار داری رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی ۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو رتی جناح نے مارسیلز سے جناح کو ایک جذباتی خط لکھا جس میں انہیں اپنی شدید وابستگی کا یقین دلایا گیا تھا ۔ اس کا یہ فقرہ یہ تھا " جو ٹریجڈی محبت سے شروع ہوئی تھی ہونا چاہیے کہ وہ محبت پر ہی ختم ہو " بمبئی کے ایم سی چھاگلہ نے جو جناح اور رتی دونوں کے قریب سے جانتے تھے اور جناح کے سیاسی حریف تھے لکھا ہے جناح نے رتن بائی کے ساتھ ہمیشہ انتہائی مروت اور محبت کا رویہ روا رکھا ۔ اختلاف کے باوجود ان کی شاہانہ زندگی کے تمام مصارف خوشی سے برداشت کئے اور عزت و احترام کا سلوک کیا ۔

جنوری ۱۹۲۹ء میں رتن بائی پھر بیمار پڑ گئیں، سرشام جناح آتے مزاج پرسی کرنے کا وقت ہوتا تو گھنٹوں باتیں کرتے۔ ماضی کی یادیں انہیں پھر قریب لا رہی تھیں کچھ مفاہمت ہو رہی تھی کہ فروری ۱۹۲۹ء کے وسط میں مرکزی اسمبلی کے بجٹ سیشن میں شرکت کرنے کے لیے جناح کو بادلِ نخواستہ دہلی جانا پڑا۔ رتی کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ ۱۹ فروری کو وہ بے ہوش ہوگئیں۔ ۲۰ فروری کو اپنی سالگرہ کے دن اُن کا انتقال ہوگیا۔ تجہیز و تکفین کے انتظامات شریف دیو جی نے اسلامی طریقے سے کیئے انہیں آرام باغ قبرستان میں دفن کیا گیا۔ جناح دفن کے وقت موجود تھے۔ انہیں قبر میں اتارتے وقت رو پڑے۔ قبر پر مٹی بھی سب سے پہلے انہوں نے ہی ڈالی۔ جناح اور رتن بائی کے مشترکہ دوست اور رفیق کار کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب رتی جناح میں جناح کو خراج تحسین ادا کیا ہے یہ شادی دل و دماغ کے سنگم سے ہوئی تھی۔ دونوں ایک جان اور دو قالب تھے۔ رتی سے شادی کے بعد جناح نے اورینٹ کلب سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور بیشتر وقت رتی کے ساتھ گزارتے تھے۔ رتی جب باہر ہوتی تھیں تو کانجی دوارکا داس سے جناح کی عافیت معلوم کرتی رہتی تھیں اور لکھتی تھیں کہ جناح عادتاً زیادہ کام کرتے ہیں انہیں اس سے باز رکھا جائے کم عمر رتی ایک معروف اور عظیم رہنما کی بیوی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے خوب واقف تھیں اور انہیں خوب ادا کیا۔

قائداعظم کے بھائی بہن اور بیٹی

قائداعظم کی شخصیت اور کردار کے بعض پہلو ایسے ہیں جو ان کے بہن بھائیوں کے حوالے سے ہی اجاگر ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اس رخ پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

محمد علی جناح اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے ان سے چھوٹی بہن تھیں، رحمت جو ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ پھر بھائی بندے علی، (پیدائش ۱۸۸۰ء) ان کی پیٹھ پر ایک اور بہن مریم بی (پیدائش ۱۸۸۲ء) مریم بی کے بعد پھر ایک بھائی احمد علی (پیدائش ۱۸۸۶ء) احمد علی کے بعد دو بہنیں شیریں (پیدائش ۱۸۸۸ء) اور فاطمہ (پیدائش ۱۸۹۲ء) فاطمہ سے چھوٹا ایک بھائی اور تھا جو پیدا ہونے کے بعد عقیقے سے پہلے اللہ کو پیارا ہوگیا۔ اس کا نام نہیں رکھا گیا تھا۔ صرف "بچو" کے عرف سے اُسے پکارا گیا تھا۔

۱۸۹۶ء میں لندن سے واپس آنے کے چند سال بعد انھوں نے اپنے خاندان کی کفالت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ ان کے گھر والے بمبئی کے کھوجے محلے میں رہتے تھے ان کی اپنی رہائش پہلے اپالو ہوٹل بمبئی میں رہی۔ پھر

ساؤتھ کورٹ کے علاقے ہیں۔ لیکن وہ اپنے گھر والوں سے برابر ملتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی بہن رحمت کی شادی کے سلسلے میں جو کردار ادا کیا وہ قابلِ ذکر ہے۔ رحمت بی کے لیے رشتے کی تلاش جاری تھی کہ کلکتے کے مشہور تاجر قاسم جمال کا پیغام آیا۔ یہ رشتہ ان کے والد جناح پونجاہ کو بھی پسند تھا۔ لیکن وہ مسلک کے فرق کی وجہ سے یہ رشتہ قبول کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ قاسم جمال خوجے تو ضرور تھے لیکن سنی خوجے تھے۔ اس لیے برادری والے اس کے حق میں نہیں تھے۔ محمد علی جناح نے کہا "دیکھنا یہ چاہیے کہ رشتہ موزوں ہے یا نہیں۔ سنی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے"۔ بڑھتے بڑھتے بات آغا خان تک پہنچی۔ محمد علی جناح نے آغا خان سے مل کر اپنے والد کو اطمینان دلایا کہ آغا خان کی ہدایت پر برادری والے اعتراض نہیں کریں گے۔ چنانچہ محمد علی جناح کے اہتمام سے رحمت کی شادی کلکتے کے سنی خوجے قاسم جمال سے ہو گئی۔ اس واقعہ سے نہ صرف محمد علی جناح کی وسیع المشربی اور بے تعصبی پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس خصوصیت پر بھی کہ وہ ذاتی معاملات میں بھی اصول اور معقولیت کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کی دوسری بہن مریم کی بھی شادی انہی کے ایماء سے بمبئی کے سنی خوجے تاجر عابدین پیر بھائی سے ہوئی۔ برادری سے باہر سنی خوجوں میں بیٹیوں کی شادی کرنے کے باعث ان کے تعلقات ننھیال والوں سے بھی ختم ہو گئے لیکن انہوں نے اصول کی خاطر اس کی بھی پرواہ نہیں کی۔

محمد علی جناح کو اپنی سب سے چھوٹی بہن فاطمہ سے شروع سے زیادہ

محبت تھی۔ وہ انہیں انگریزی اسکول میں تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ خاندان اور برادری کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔ بڑی مخالفت ہوئی لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے آخر انہوں نے فاطمہ کو بمبئی کے مضافات میں باندرہ کے کانونٹ اسکول میں داخل کرا دیا۔ اتوار کے اتوار وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فاطمہ کو دیکھنے جاتے تھے۔ یوں تو وہ بمبئی میں اپنے سارے خاندان کے کفیل تھے۔ لیکن فاطمہ پر ان کی خصوصی توجہ تھی۔ جب فاطمہ نے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کر لیا تو محمد علی جناح نے انہیں کلکتے کے ایک ڈینٹل اسکول میں تعلیم کے لیے بھیج دیا۔ وہاں سے انہوں نے ڈینٹسٹری میں ڈپلومہ لیا۔ کچھ دنوں بمبئی میں پریکٹس بھی کی۔ لیکن رتن بائی کی علیحدگی کے بعد سے وہ مالا بار ہل ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر واقع ان کی کوٹھی پر ان کے ساتھ رہنے لگیں انہوں نے بہت شفقت اور محبت سے اپنے بڑے بھائی کی دیکھ بھال کی۔ وہ ان کی ہمدم و جلیس تھیں۔ دوست اور غمگسار بھی۔ بعد کو ان کی سیاسی مشیر بھی۔ وہ آخر وقت تک ان کے ساتھ رہیں۔ وہ قائداعظم کو عموماً میرا بھائی "مائی برادر" کہتی تھیں اور پیار سے جن کہتی تھیں۔ قائداعظم ان کی خدمات کا اعتراف بڑی محبت اور خلوص سے کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۶۸ء میں اپنی وفات تک انہوں نے قوم کی رہبری اور راہنمائی جاری رکھی بھائیوں میں سے بندے علی بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ سب سے چھوٹے بھائی احمد علی نے بمبئی میں گمنامی کی زندگی بسر کی۔ بہنوں میں سے صرف شیریں بائی حیات ہیں۔

بیٹی

قائداعظم کی اکلوتی بیٹی دینا جو ۱۴ اگست ۱۹۱۹ء کو لندن میں پیدا ہوئی تھیں۔ جب وہ دونوں لندن میں ٹھہرے ہوتے تھے۔ دینا، لا بارہل کی کوٹھی میں ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ جب بڑی ہوئیں تو انہوں نے انہیں لندن کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ جب وہ کبھی لندن میں ہوتے تو وہ اور مس جناح دونوں دینا سے ملنے اسکول جاتے تھے۔ تعطیل وہ ان کے ساتھ گذارتی تھیں۔ دینا کی ننھیال پارسی تھیں۔ ان کا وہاں آنا جانا بھی تھا۔ ان کے اثر سے دینا نے ایک پارسی نوجوان نیول واڈیا سے شادی کرلی قائداعظم نے ناراض ہو کر دینا کو عاق کر دیا تھا۔ لیکن ان سے انسانی تعلقات ختم نہیں کیے۔

قائداعظم اور طلبہ

بحیثیت قوم کے قائداعظم کو خوب معلوم تھا کہ قوم کے کس حصے سے کیا کام لینا ہے۔ اور کیسے لینا ہے۔ ۱۹۳۷ء کے الیکشن کے جیتتے جیتتے ہی مسلم لیگ کی سیاسی جدوجہد ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی قائداعظم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ملک کے دوسرے حصوں کے مسلم طلبہ کو تحریک پاکستان سے روشناس کیا اور انہیں پاکستان کے حصول کی جدوجہد کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ تحریکِ پاکستان کو ولولے، جوش، قربانی اور ایثار کے ساتھ نئے ذہن، نئی فکر کی ضرورت بھی تھی۔ تاکہ تحریک پاکستان کے مقاصد کی روشنی گھر گھر پہنچ جائے۔ نوجوان طلبہ ہی اس کام کو بہتر طور پر انجام دے سکتے تھے چنانچہ قائداعظم نے طلبہ کو تحریک پاکستان کا ہراول دستہ بنایا۔

لیکن طلبہ کی قوت کو کام میں لانا کوئی سستا سیاسی کرتب نہ تھا۔ قائداعظم سستی سیاست کے حربے استعمال کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ اعلیٰ مقاصد کو اعلیٰ طریقوں سے حاصل کرنے کے قائل تھے۔ انہوں نے طلبہ کے جوش و خروش، ولولے اور ایثار کے جذبے ہی سے کام نہیں لیا بلکہ ان کی ذہنی اور جذباتی تربیت بھی کی۔ انہیں ان کی تعلیمی ذمہ داریوں سے آگاہ بھی کیا

نظم و ضبط کا پابند ہونے کی تلقین بھی کی۔ انہیں نوجوان طلبہ پر اتنا اعتماد تھا کہ اُنہوں نے فرمایا:

"مجھے اُمید ہے کہ تم میں سے بہت سے جناح پیدا ہوں گے۔ مجھے مستقبل سے کوئی اندیشہ نہیں اگر یہ تمہارے ہاتھ میں ہو۔"

لیکن جناح بننا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس مشکل کام کو آسان کرنے کی راہیں بھی انہوں نے خود ہی بتائیں۔

مسلم سٹوڈینٹس فیڈریشن کے وفد سے آپ نے فرمایا، "آپ مستقبل کے معمار قوم ہیں۔ اس لیے جو مشکل کام آپ کے سر پر کھڑا ہے اس سے نمٹنے کے لیے اپنی شخصیت میں نظم و ضبط پیدا کیجئے۔ مناسب تعلیم اور مناسب تربیت حاصل کیجئے۔ آپ کو پورا پورا احساس ہونا چاہیے کہ آپ کی ذمہ داریاں کتنی زیادہ اور کتنی شدید ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آپ کو ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیے۔"

مصروف عمل ہونے کی تاکید

میں آپ کو مصروف عمل ہونے کی تاکید کرتا ہوں۔ کام، کام اور بس کام۔ پر سکون طریقے سے، صبر و برداشت اور انکساری کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے جائیے۔ (آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس)

(۱۵، نومبر ۱۹۴۲ء، جالندھر)

اسی بیان میں آپ نے مسلم طلبہ کو روشن ضمیر اور دانائے راز ہونے کی

ضرورت سے بھی آگاہ کیا۔ واضح رہے کہ یہ زمانہ آغاز تحریک پاکستان کا تھا۔
آپ نے فرمایا:۔

جب تک آپ طالب علم ہیں آپ اپنی کوششوں کو محض تیاری تک محدود رکھیں اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ تمام ہندوستان کے مسلم طلبہ کو منظم کریں تاکہ مسلمانان ہند کے حقوق کی پوری حفاظت ہو سکے۔ آپ کو چاہیے کہ مسلمانان ہند کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی نشوو نما اور ترقی کے لیے ایک لائحہ عمل بنائیں اور اسے عملی جامہ پہنائیں۔ آپ کا یہ فرض بھی ہے کہ آپ اسلامی تہذیب کو فروغ دیں۔ میں نے ابھی کہا ہے آپ عملی سیاست میں حصہ نہ لیں میں اس امر کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے میرا اصل مطلب کیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کریں جن کے وسیلے سے آپ طالب علمی کی زندگی ختم کرنے کے بعد عملی سیاست کی جدوجہد میں کامیاب ہوں۔ آپ اس وقت اپنے آپ کو تیار کریں اور ضروری ساز و سامان یعنی علم و آگہی اور توفیق عمل سے آراستہ کریں۔

آپ کی اوّلین اور اہم ترین ضرورت ہے مطالعہ۔ مطالعہ۔۔ مطالعہ!
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان طلبہ اور عام طور پر مسلمانوں میں عظیم الشان بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ ترقی کی ضرورت کا احساس موجود ہے۔ جوش و خروش ہے، ولولہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی جذباتی نعرے بھی سنائی دیتے ہیں۔ آپ اسی صورت میں دوسروں کے عقیدے بدل سکتے ہیں کہ پہلے آپ خود روشن ضمیر

بن جائیں۔ آج کل دانائے راز کی خصوصی ضرورت ہے کہ گمراہ کن باتیں زور و شور سے کی جا رہی ہیں۔

تعلیم پہلا فرض

آپ تعلیم پر پورا دھیان دیں۔ اپنے آپ کو عمل کے لیے تیار کریں۔ یہ آپ کا پہلا فریضہ۔ آپ کی تعلیم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ آپ دورِ حاضر کی سیاست کا مطالعہ کریں یہ دیکھیں کہ آپ کے گرد دُنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

(کراچی ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء)

لیکن پاکستانی طلبہ کے لیے صرف علم کافی نہیں تھا۔ کردار، عزم، حوصلے کی بھی ضرورت تھی۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

”میں پاکستان کے ہر باشندے اور بالخصوص نوجوان طلبہ کو یہ بات اچھی طرح بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ خدمت، ہمت اور برداشت کے سچے جذبے کا مظاہرہ کریں۔ بلند کرداری کی ایسی مثالیں قائم کریں کہ آپ کے ہم عصر اور آنے والی نسلیں آپ کی تقلید کریں۔“

قائداعظم کی نظر میں، طالب علم کا کام علم کی طلب و جستجو ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو جہاد کے لیے تیار کرنا بھی ہے آپ نے اسی خطاب میں طلبہ کو یہ تلقین بھی کی:

”اپنے حوصلوں کو ہر صورت میں بلند رکھیے۔ موت سے نہ ڈریے ہمارا مذہب

یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے کے لیے ہمیں موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیے۔ مسلمان کے لیے اس سے بہتر اور کوئی وسیلۂ نجات نہیں ہو سکتا کہ وہ صداقت کی خاطر شہید کی موت مرجاتے"۔

بچّوں کا بابا

بڑے آدمیوں کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ بچوں پر غیر معمولی شفقت کرتے ہیں۔ وہ قائداعظم جو رزم حق و باطل میں فولاد تھے جن سے بڑے بڑے جابر خم کھاتے تھے۔ وہ بچوں کے لیے ریشم سے بھی زیادہ نرم تھے۔ ایک بار کوئٹہ میں لوگوں نے یہ منظر دیکھا کہ آپ کھلونوں کی دُکان کے سامنے ایک بڑی چم چم کرتی کار آکر رکی۔ ایک طویل القامت، خوش لباس وجیہہ اور شاندار شخص کار سے باہر آیا اور کھلونوں کی دکان میں داخل ہو گیا۔ بعض نے پہچان لیا، اور قائداعظم زندہ باد کا نعرہ لگایا۔

وہ قائداعظم کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ حیران تھے کہ کھلونوں کی دکان پر قائداعظم کیا کر رہے ہیں۔ حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کا قائداعظم بچوں بالوں کا بڑا بابا بھی تھا۔ وہ کوئٹہ میں جس خاندان کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے اس گھر کا ایک چھوٹا بچہ ان سے بہت مانوس ہو گیا وہ انہیں دادا کہہ کر پکارتا اور اپنی ماں کے منع کرنے کے باوجود ان دادا کے کمرے میں اکثر دوڑ آتا۔ قائداعظم اس کو زانو پر بٹھا لیتے اور اس کی پیاری پیاری باتوں سے جی بہلاتے۔ وہ اس کے ساتھ

بچوں کے کھیل کھیل لیتے۔ اپنی بے پناہ مصروفیت سے وقت نکال کر وہ کھلونوں کی دکان میں اس بچے کے لیے کلدار گھوڑا خریدنے گئے تھے۔ بچوں سے ان کی دلچسپی محض اس لیے نہیں تھی کہ وہ اپنی پیاری پیاری باتوں اور معصوم شرارتوں سے ان کا جی بہلاتے تھے۔

بچوں سے بھی ان کی محبت اور شفقت ذاتی نہیں تھی۔ بچے ان کی نظر میں مستقبل کے معمار تھے۔ قوم کی آئندہ امیدیں۔ اس لیے جب بھی جہاں بھی موقع ملتا وہ بچوں اور نوجوانوں پر نظر کرم فرماتے۔ ایک بار ان کا جلوس ایک شہر کے بازار سے گزر رہا تھا۔ کسی چھت کے اوپر سے دو چھوٹے بہن بھائیوں نے انہیں پہچان لیا اور چیخ پڑے "قائداعظم" "قائداعظم" کی نظریں ان کی طرف اٹھیں اور وہ انہیں دیکھ کر مسکراتے، بچوں کے پاس دو نارنگیاں تھیں۔ وہی انہوں نے عقیدتاً پھینک دیں۔ کھلی کار میں نارنگیاں آ کر گریں۔ قائداعظم نے انہیں اُٹھا لیا اور اپنے ننھے عقیدت مندوں کی نشانی کو دیکھ کر دیر تک اپنے ہاتھوں میں رکھا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے ایک بار قائداعظم نے ایک گاؤں سے گزرتے ہوتے کار روکی تو بہت سے دیہاتی جمع ہو گئے اور بار بار قائداعظم زندہ باد" اور "پاکستان زندہ باد" کے نعرے بلند ہونے لگے اور بعض دوڑ کر ہار بنانے لگے۔ قائداعظم نے دیکھا کہ ایک دس برس کا لڑکا بہت بڑھ بڑھ کر نعرے لگا رہا ہے اور بہت جوش میں ہے، قائداعظم نے اُسے پیار سے بلایا اور پوچھا میرے بچے پاکستان زندہ باد کا مطلب کیا ہے؟ اس نے کہا

جناب زیادہ تو آپ جانتے ہوں گے۔ مجھے تو اتنا معلوم ہے جہاں مسلمان زیادہ ہیں مسلمان حکومت کریں اور جہاں ہندو زیادہ ہیں وہاں ان کی حکومت ہو، قائداعظم نے بچے کی پیٹھ تھپتھپائی اور بہت خوش ہوئے۔ بعد کو وہ اکثر اس واقعہ کا ذکر کرتے تھے اور کہتے تھے۔ ہمارے پاس پروپیگنڈے کے ذرائع نہیں ہیں۔ لیکن پاکستان کی آواز گوشے گوشے میں پہنچ چکی ہے۔

ایک بار گیارہ برس کی ایک بچی نے انہیں رومال پر پاکستان کا نقشہ کاڑھ کر بھیجا۔ قائداعظم اس تحفے سے بہت خوش ہوئے۔ بعد کو یہ رومال انہوں نے وائسرائے کو دکھایا۔ اور کہا پاکستان کو اب کون روک سکتا ہے۔ جب پاکستان کی تحریک نے زور پکڑا اور لیگ نے چندے کی اپیل کی تو ہزاروں لاکھوں بچوں نے اپنے جیب خرچ، اپنی عیدیاں اپنے سالگرہ کے انعام قائداعظم کو منی آرڈر کیے۔ قائداعظم اپنے ہاتھ سے "ایم اے جناح" رسید پر لکھتے تھے، اور بچے یہ رسیدیں اپنی آنکھوں سے لگاتے اور سونے سے زیادہ عزیز رکھتے۔

ذاتی کوائف

عقیدہ

محمد علی جناح آبائی طور پر اسماعیلی خوجے تھے۔ ابوالحسن اصفہانی کی روایت کے مطابق ۲۱ برس کی عمر میں انہوں نے اثنا عشری مسلک اختیار کر لیا تھا۔ لیکن عملی طور پر وہ وسیع المشرب مسلمان تھے۔ کسی عقیدے سے تعصب نہ تھا۔ عام مسجدوں میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ فاطمہ جناح کا مسلک بھی یہی تھا انہوں نے ایک مجتہد سے فرمایا میں نہ شیعہ ہوں نہ سُنی۔ میں صرف مسلمان ہوں۔ رسُول اللہ نے ہمیں صرف اسلام کی تعلیم دی ہے۔

زبان

قائداعظم کی آبائی زبان گجراتی تھی۔ لیکن مشن سکول میں انگریزی کی تعلیم پانے اور انگلستان میں پڑھنے کی وجہ سے علمی طور پر ان کی زبان انگریزی ہو گئی تھی۔ زیادہ تر انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ تحریک پاکستان کے وقت سے انہوں نے اردو سیکھنا شروع کر دی تھی اور آخر میں ذرا رک رک کر اردو میں تقریر کر لیتے تھے۔ لیکن پاکستان کی قومی زبان کے معاملے میں ان کا ذہن صاف تھا۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان میں انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی۔

لباس

بچپن میں گجراتی لباس پہنتے تھے۔ وہی ان کے گھر کا عام لباس تھا۔ لندن میں قانون کی تعلیم کے زمانے سے انہوں نے انگریزی لباس اختیار کر لیا تھا لیکن ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں پہلی بار انہوں نے قراقلی ٹوپی کے ساتھ قومی لباس زیب تن کیا۔ تحریک پاکستان کے زمانے میں بیشتر وہ قومی لباس ہی زیب تن فرماتے تھے۔ یہ قومی لباس بھی بے داغ اور بہترین ہوتا تھا۔ لباس کے معاملے میں ان کا ذوق بہت بلند اور نفیس تھا۔ آخری عمر میں اُنہوں نے غیر ملکی کپڑا خریدنا بھی بند کر دیا تھا۔ اور کم تر درجے کے پاکستانی کپڑے سے گزارا کرتے تھے۔ مس فاطمہ جناح اکثر ان کے لیے کھڈیوں کا کپڑا خریدتی تھیں۔

مکان

بمبئی میں مالا بار ہل ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر ان کا انیسویں صدی کے طرز تعمیر کا بنگلہ خوش ذوقی اور حُسن آرائش کی تصویر تھا۔

پسندیدہ چیزیں

شخصیت کمال اتاترک

کتاب گرے وولف (اتاترک کی سوانح حیات)

شاعر شکسپیئر۔ شیلے

پھول　گلاب / کارنیشن

پیڑ　صنوبر

کھیل　آؤٹ ڈور بلیرڈ اور ، کرکٹ
ان ڈور بلیرڈ اور
شطرنج

ہابی　گھوڑسواری (بچپن اور نوجوانی میں)

کھانے　کباب ، حلوہ ، پوری ، پاپڑ

سویٹ ڈش - فیرنی

سگریٹ کا برانڈ کریون اے / سگار بھی پیتے تھے

نظریۂ پاکستان

نظریۂ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ ہے۔ خوش قسمتی سے اس موضوع پر خود قائداعظم نے مختلف موقعوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان بیانات اور تقریروں کے منتخب ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں۔

مسلم قومیت کی بنیاد

پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا۔ جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے۔ وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی۔ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب ۸، مارچ ۱۹۴۴ء)

اسی تقریر میں آگے چل کر آپ نے فرمایا:

آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا محرک جذبہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال یہ

اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔

اس تقریر سے اس گمراہ کن خیال کی بھی تردید ہوتی ہے کہ پاکستان کے مطالبے کو ہندوؤں کی تنگ دلی نے جنم دیا۔ یا یہ محض معاشی خوشحالی حاصل کرنے کا ذریعہ تھا یا صرف سیاسی اقتدار کے حصول کا وسیلہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کا حصول بھی ضروری تھا۔ معاشی اور اقتصادی خوشحالی بھی مدنظر تھی لیکن اس سے بھی اہم تر مسئلہ اور اصل مسئلہ مسلمانوں کے قومی وجود، مسلمانوں کے بحیثیت مسلمان زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا مسئلہ تھا جو بغیر پاکستان کے حصول کے ممکن نہیں تھا۔

نظریہ پاکستان اور دو قومی نظریے کی وضاحت قائداعظم نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرار داد پاکستان پر تقریر کرتے ہوتے ان الفاظ میں کی:

مسلمان ایک اقلیت نہیں ہیں۔ مسلمان ایک قوم ہیں۔ قومیت کی تعریف جس طرح کی جاتے مسلمان اس تعریف کی رو سے ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ان کی اپنی الگ مملکت اور اپنی جداگانہ خود مختار ریاست ہو۔ ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ برصغیر کے اندر ہم ایک آزاد قوم بن کر اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہم آہنگی اور امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کریں ہماری تمنا ہے کہ ہماری قوم اپنی روحانی، اخلاقی، تمدنی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو کامل ترین نشو و نما بخشے اور اس مقصد کے لیے وہ طریق عمل اختیار کر سکے جو اس کے نزدیک بہترین ہو اور ہمارے نظریات اور نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔

آپ نے مزید فرمایا:-

اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں ہیں بلکہ درحقیقت وہ دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ ان کے پیرو آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے اور نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں ان کا تعلق واضح طور پر دو مختلف تہذیبوں سے ہے اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ متصادم رہتے ہیں۔

انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے تاریخی وسائل اور ماخذ مختلف ہیں۔ انکی رزمیہ نظمیں، ان کے قومی ہیرو اور قابلِ فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر ایک قوم کا عظیم رہنما دوسری قوم کی بزرگ و برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے ایک قوم کی فتح دوسری کی شکست ہوتی ہے۔ پس دونوں ہر اعتبار سے علیحدہ قومیں ہیں۔

اتحاد، ایمان، تنظیم

"قائداعظم نے قوم کو جو ٹھوس نعرہ دیا وہ ہے، اتحاد، ایمان، تنظیم، یہ کوئی سیاسی نعرہ نہیں تھا جو کسی وقتی مصلحت کے تحت کسی محدود وقتی مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے بلند کیا گیا ہو۔ یہ قائداعظم کی اپنی زندگی کے رہنما اصول تھے۔ جن پر وہ تمام زندگی خود کاربند رہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ انہی بنیادی اصولوں کو انہوں نے اپنے ورثے کے طور پر قوم کے سپرد کیا۔

آج قائد اعظم خود دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کے دئے اصول قوم کی رہنمائی کے لیے روشنی کے مینار کی طرح موجود ہیں۔ اتحاد، ایمان، تنظیم کا نعرہ ایک تکون ہے جس میں بنیادی اہمیت ایمان کو حاصل ہے۔ اتحاد اور تنظیم، ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔ قائد اعظم نے قوم کو اتحاد، ایمان، تنظیم کو بار بار تلقین کی۔

۲۷، جون ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کونسل بمبئی سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا:

میں محسوس کرتا ہوں کہ اب مسلم لیگ کے لیے وہ وقت آگیا ہے جب ہمارا نعرہ اتحاد، ایمان اور تنظیم ہونا چاہیے اگر ہماری قوم میں کافی طاقت نہیں ہے تو ہمیں کافی طاقت پیدا کرنا ہوگی۔

۲۵۔ جون ۱۹۴۷ء کو آپ نے فرمایا:

"مسلمان کی نجات ان کے اتحاد، ایمان، اور تنظیم میں پنہاں ہے"۔

۷، جولائی ۱۹۴۷ء کو لندن مسلم لیگ کی دعوت کے جواب میں قائد اعظم نے یہ تار دیا۔

پاکستان بن گیا اس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ آپ حصول پاکستان کی خوشی میں ایک ضیافت منعقد کر رہے ہیں اور اس میں مجھے بھی مدعو کیا ہے۔ اب ہمارے سامنے پاکستان کی تعمیر و ترقی کا زیادہ بڑا اور مشکل کام ہے جو ہماری طاقت و توانائی کے ایک ایک ذرے کا تقاضا کرتا ہے۔ انشاءاللہ ہم اس نئی اور سب سے بڑی اسلامی مملکت کو مکمل اتحاد، ایمان اور تنظیم سے

دنیا کی ایک عظیم اور مثالی مملکت بنا دیں گے۔

پاکستان بننے کے چند مہینے بعد ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے لاہور ریڈیو سے قوم کو یوں خطاب کیا:۔

اگرچہ افق پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے ہیں لیکن میں آپ سے اپیل کرتا ہوں اور قوم کے نام پیغام دیتا ہوں کہ اپنے اندر جذبہ اور جوش و خروش پیدا کرو اور حوصلے اور اُمید کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ انشاء اللہ کامیابی ہماری ہے ان مشکل حالات میں کیا ہم مایوس ہو کر بیٹھ جائیں؟ ہرگز نہیں۔ اسلام کی تاریخ اولوالعزمی، حوصلے اور مستقل مزاجی کی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ پس مشکلوں، رکاوٹوں اور مصیبتوں کے باوجود آگے بڑھتے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ سات کروڑ افراد کی ایسی متحد قوم جو عظیم ارادے کی مالک ہو۔ عظیم تہذیب رکھتی ہو۔ عظیم تاریخ کی وارث ہو اسے کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہونا چاہیے۔ اب یہ آپ پر ہے کہ کام کریں۔ کام۔ کام۔ کام کامیابی ہمارا مقدر ہے اور اپنا یہ نعرہ کبھی نہ بھولیے۔ اتحاد، ایمان، تنظیم۔

۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے لوگوں کے نام نشریاتی پیغام میں قائداعظم نے "ایمان" کی یوں وضاحت کی۔

ہماری وحدت اور ہم آہنگی کا راز ہے ایمان۔ اللہ پر ہمارا ایمان۔ اپنی ذات پر ہمارا ایمان۔ اپنی تقدیر پر ہمارا ایمان۔

۲۸ مارچ کو ڈھاکہ کے جلسہ عام میں قائداعظم نے فرمایا: "پاکستان مسلمانوں کے اتحاد کا مظہر ہے اور اُسے ایسا ہی رہنا چاہیے۔ سچے مسلمانوں کی حیثیت

سے آپ کا فرض آپ دل و جان سے اس کی پاسبانی اور حفاظت کریں۔ اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ ہم پہلے بنگالی۔ پنجابی۔ سندھی وغیرہ ہیں اور مسلمان اور پاکستانی محض اتفاقیہ تو جان لیجئے کہ پاکستان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

اتحاد کی ضرورت پر ۱۷ اپریل ۱۹۴۸ء کو پشاور میں قبائلی سرداروں سے خطاب کرتے ہوتے آپ نے کہا:

"ہمیشہ سے میری کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو جائے۔ اور مجھے اُمید ہے کہ اس عظیم مملکت پاکستان کی تعمیر و ترقی کا جو کام اس وقت ہمارے سامنے ہے اُسے دیکھتے ہوتے سب کو اس بات کا پُورا احساس ہو گا کہ اس وقت اتحاد کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔"

قائداعظم نے نہ صرف اتحاد کی تلقین کی۔ بلکہ اتحاد کی بنیاد کی بھی نشاندہی کی۔ اس خطاب میں آپ نے فرمایا:

"ہم مسلمان ایک خدا ایک رسول، ایک کتاب پر یقین رکھتے ہیں پس یہ لازمی اور ناگزیر ہے کہ ہم ملت کی حیثیت سے بھی ایک ہُوں۔"

پاکستان فضائیہ کے حوالے سے تنظیم کی اہمیت اور ضرورت پر آپنے فرمایا:

"ہوائی جہازوں اور ان کے عملے کی تعداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل چیز فضائیہ میں جذبہ شوق اور سخت نظم و ضبط ہے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف نظم و ضبط اور خود اعتمادی ہی پاکستان کی فضائیہ کو پاکستان کے شایانِ شان بن سکتی ہے۔"

پاکستان بحریہ کے جہاز "دلاور" کے افتتاح پر قائداعظم نے ایمان،

تنظیم کی اہمیت پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا۔

" پاکستان کے دفاع کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں ہر ایک کو اپنی جگہ الگ الگ انتہائی اہم کردار ادا کرنا ہے اس کے لیے آپ کا نعرہ یہ ہونا چاہیے ایمان ۔ تنظیم ۔ ایثار"۔

تعمیرِ پاکستان

اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم سے اور قائداعظم کی رہنمائی میں برصغیر کے مسلمانوں کی مسلسل بے مثال جدوجہد، بے دریغ قربانی و ایثار سے ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بہت ہی مشکل حالات میں وجود میں آگیا۔ لیکن تعمیرِ پاکستان کا مشکل تر مرحلہ باقی تھا۔ ۱۷؍اگست ۱۹۴۷ء کو جمعۃ الوداع تھا۔ قائداعظم نے اپنے پیغام میں کہا:

• مسلمانانِ ہند نے دُنیا کو دکھا دیا ہے کہ وہ ایک متحد قوم ہیں ان کا نصب العین صحیح اور انصاف پر مبنی ہے۔ آیئے اس نعمت پر ہم عاجزی و انکسار سے خُدا کا شکر بجا لائیں اور دُعا کریں کہ وہ ہمیں اس نعمت کے لائق بنا دے آج کے دن قومی تاریخ کا ایک صبر آزما دور ختم ہو رہا ہے اور ایک نئے اور قابلِ قدر دور کا آغاز ہو رہا ہے۔

پاکستان کی سرزمین میں زبردست خزانے چھُپے ہوئے ہیں مگر اس کو ایک ایسا ملک بنانے کے لیے جو مسلمان قوم کے رہنے کے قابل ہو۔ ہمیں اپنی قوت اور محنت کے ذخیرے کا ایک ایک ذرہ صرف کرنا پڑے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ تمام پاکستانی پاکستان کی تعمیر میں دل و جان سے حصہ لیں گے۔

دوسرے دن ۱۸؍اگست ۱۹۴۷ء پاکستان کی پہلی عید تھی اپنے یوم عید

کے پیغام میں قائداعظم نے پھر پاکستانیوں کو یاد دلایا۔

"اس میں شک نہیں کہ ہم نے پاکستان حاصل کر لیا ہے لیکن یہ تو محض آغاز ہے اب بڑی بڑی ذمہ داریاں ہمارے کندھوں پر آپڑی ہیں اور جتنی بڑی ذمہ داریاں ہیں اتنا ہی بڑا ارادہ، اتنی ہی عظیم جدوجہد کا جذبہ ہم میں پیدا ہونا چاہیے۔ پاکستان حاصل کرنے کے لیے جو قربانیاں دی گئی ہیں اور جو کوششیں کی گئیں ہیں پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے لیے بھی کم ازکم اتنی ہی قربانیوں اور کوششوں کی ضرورت پڑے گی۔ حقیقی معنوں میں ٹھوس کام کا وقت آپہنچا ہے اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ مسلمانوں کی ذہانت اور فراست اس بارِ عظیم کو حوصلے سے اٹھا سکے گی اور اس بظاہر پیچیدہ اور دشوار گزار راستے کی تمام مشکلات کو آسانی سے طے کر لے گی۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو حکومت پاکستان کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے تخلیق پاکستان کے نصب العین کی یوں وضاحت کی۔

کسی قومی ریاست کو معرضِ وجود میں لانا مقصد بالذات نہیں ہو سکتا بلکہ کسی مقصد کے حصول کے ذریعہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں جو ہماری تہذیب و تمدن کی روشنی میں پھلے اور پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔

اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے متواتر قربانی، ایثار کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اپنے عیدالاضحیٰ کے پیغام میں قائداعظم نے پاکستانیوں

کو پھر یاد دلایا۔

ہم جتنی زیادہ تکلیفیں سہنا اور قربانیاں دینا سیکھیں گے اتنا ہی زیادہ پاکیزہ، خالص اور مضبوط قوم کی حیثیت سے ہم ابھریں گے۔ جیسے سونا آگ میں تپ کر کندن ہو جاتا ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کے مہینے پاکستانیوں کے لیے بہت صبر آزما تھے ان نہایت ہی مشکل حالات میں قائداعظم اپنی منصبی مصروفیتوں کے باوجود قوم کی راہنمائی فرماتے رہے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور کے جلسۂ عام میں قائداعظم نے اعلان کیا۔

"اگر ہم ہر معاملے میں راہنمائی قرآن مجید سے حاصل کریں تو مجھے یقین ہے کہ آخری کامیابی ہماری ہو گی"۔

اسی دن ایک نشری بیان میں قائداعظم نے قوم کو یہ پیغام دیا۔

" آیئے ہم اپنی عظیم قوم اور اپنی خود مختار مملکت پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے لیے کچھ تدبیر کریں۔ یہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے سنہری موقع ہے اور اس کی خوش قسمتی بھی کہ وہ اپنے حصے کا بھرپور اور مکمل کردار ادا کرے اور بڑی سے بڑی ذاتی قربانیاں دے اور پاکستانی قوم اور ملک کو دُنیا کی عظیم ترین قوم اور ملک بنانے کے لیے انتھک دن رات محنت کرے۔ اب پاکستان، اس کی عزت اور ترقی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بلاشبہ ہم میں بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ پاک سرزمین زبردست وسائل و ذرائع اور امکانات ترقی کے حامل ہے۔ باری تعالیٰ ہمیں قدرتی دولت بڑی

فراوانی کے ساتھ عطا کی ہے۔ اَب یہ کام انسانی ہاتھوں کا ہے کہ وہ اس دولت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

اس بارِ عظیم (تعمیرِ پاکستان) کی شدت اور سنگینی سے گھبرانا نہیں چاہیئے تاریخ میں ایسی نئی اقوام کی کئی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے محض قوتِ ارادی اور بلند کرداری سے خود کو بنایا اور عظیم کیا۔ آپ کا خمیر فولادی قوتوں سے اُٹھا ہے اور ہمت کے معاملے میں آپ دُنیا میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ پھر آخر آپ دوسروں کی طرح کامیاب کیوں نہیں ہو سکتے۔ خاص طور پر اپنے آباد اجداد کی طرح کی کامیابی۔ آپ کو اپنی ذات میں فقط مجاہدوں کی سی سپرٹ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ ایسی قوم ہیں جس کی تاریخ حیرت انگیز طور پر بلند کردار، باحوصلہ، شجاع اور اولوالعزم ہستیوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی روایات کی رسّی مضبوطی سے تھام لیجئے اور اپنی تاریخ میں شان و شوکت کے ایک اور باب کا اضافہ کیجئے۔

تعمیرِ پاکستان میں افواجِ پاکستان کو جو کردار ادا کرنا تھا اس کی نشاندہی یوں کی:

"ہم نے پاکستان کی آزادی کی جنگ تو جیت لی ہے لیکن اس آزادی کو برقرار رکھنے اور مستحکم اور مضبوط بنیاد پر تعمیر کرنے کی جنگ، سنگین تر جنگ، ابھی جاری ہے۔"

(افواجِ پاکستان سے خطاب ۲۱ فروری ۱۹۴۸ء)

قائدِ اعظم اور افواجِ پاکستان

قائداعظم ہر میدان میں قائدِاعظم تھے۔ پاکستان بنتے ہی پاکستانی افواج کو منظم کرنا اور ضروری اسلحہ سے لیس کرنا ایک اہم مسئلہ تھا۔ لیکن اس سے بھی اہم تر مسئلہ یہ تھا کہ پاکستانی مسلح افواج کو ان کی نئی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جائے جو ایک آزاد نظریاتی ریاست کے بازوئے شمشیرزن کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی تھیں۔ وہ اب محض بہادر سپاہی ہی نہیں تھے بلکہ ایک عظیم نظریئے، ایک عظیم نصب العین کے محافظ سپاہی تھے۔ قائداعظم نے بحیثیت سربراہ مملکت اور بحیثیت قوم کے سب سے بڑے قائد کے، مسلح افواج کی تنظیم اور ترقی میں ذاتی دلچسپی لی اور انہیں ان کی نئی ذمہ داریوں اور نئی منزلوں سے آگاہ بھی کیا۔

۱۴ رجون ۱۹۴۸ء کو کوئٹے میں قائداعظم نے افواجِ پاکستان کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

"پاکستان کی دوسری ملازمتوں کے مقابلے میں افواجِ پاکستان کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اسی نسبت سے آپ کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اور سنا ہے اس کی بنا پر بلاشبہ کہہ سکتا ہوں کہ ہماری افواج کے حوصلے قابلِ فخر اور ہمتیں بلند ہیں اور سب سے زیادہ اطمینان کی بات یہ ہے کہ

ہر افسر اور سپاہی خواہ وہ کسی فرقے، نسل یا علاقے سے ہو۔ وہ سچے پاکستانی کی طرح کام کر رہا ہے۔ اگر آپ اسی جذبے سے سچے ساتھیوں اور سچے پاکستانیوں کی طرح بے غرضی سے کام کرتے رہے تو پھر پاکستان کو کسی کا ڈر نہیں"۔ پاکستان کی تعمیر اور ترقی میں افواجِ پاکستان کو جو کردار ادا کرنا تھا۔ اس کی نشاندہی کرتے ہوئے اور افواج پاکستان کو ایک قومی نقطۂ نظر دیتے ہوئے قائداعظم نے ۲۱، فروری ۱۹۴۸ء کو کراچی میں افواجِ پاکستان سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :۔

"ہم نے پاکستان کی آزادی کی جنگ تو جیت لی ہے لیکن اس آزادی کو برقرار رکھنے اور پاکستان کو مستحکم اور مضبوط تر بنیادوں پر تعمیر کرنے کی سنگین تر جنگ ابھی جاری ہے اور اگر ہمیں ایک عظیم قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہم کامیابی حاصل نہیں کر لیتے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ وہی زندہ رہتا ہے جو زندہ رہنے کا زیادہ اہل ہوتا ہے ہمیں ثابت کرنا ہے کہ ہم اس نئی آزادی کے اہل ہیں۔

آپ نے دُنیا کو فسطائیت اور آمریت کے پنجوں سے چھڑایا ہے آپ نے جمہوریت کی بقا کے لیے دُنیا کے دور دراز گوشوں میں جا کر دادِ شجاعت دی ہے اب ایک نئی منزل ایک نیا چیلنج آپ کے سامنے ہے۔ اَب آپ کو اپنی پاک سرزمین میں اسلامی جمہوریت اسلامی معاشرتی انصاف اور انسانی مساوات کے اصولوں کی تجدید اور پاسبانی کرنی ہے۔ اس اہم تر سخت تر کام کے لیے آپ کو ہمہ وقت تیار ہمہ تن ہوشیار رہنا پڑے گا۔ آرام کرنے کا

وقت ابھی نہیں آیا ہے اگر آپ ایمان تنظیم اور بے لوث فرض شناسی کے زرّیں اصولوں پر کاربند رہے تو کوئی شے ایسی نہیں جسے آپ حاصل نہ کرسکیں"۔

۲۳ جون ۱۹۴۸ء پاکستان نیوی کے جہاز 'دلاور' کے افتتاح کی تقریب پر قائداعظم نے فرمایا:۔

"پاکستان کے دفاع کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں آپ میں سے ہر ایک کو اپنی جگہ الگ الگ انتہائی اہم کردار ادا کرنا ہے اس لیے آپ کا نعرہ ہونا چاہیے ایمان، تنظیم اور ایثار آپ اپنی تعداد کے کم ہونے پر نہ جائیے۔ اس کمی کو آپ کو ہمت و استقلال اور بے لوث فرض شناسی سے پورا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اصل چیز زندگی نہیں بلکہ صبر و تحمل اور عزم صمیم ہیں جو زندگی کو زندگی بناتے ہیں"۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں افواج پاکستان کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"مجھے پورا پورا احساس ہے کہ آپ میں سے بیشتر ایسے ہیں جنہوں نے گذشتہ جنگ کے دوران شدید اور سخت محنت کی زندگی بسر کی ہے۔ اب انہیں آرام کی ضرورت ہے لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے لیے تو جنگ اب شروع ہوئی ہے اور اگر ہم اس میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں غیر معمولی محنت اور جد و جہد سے کام کرنا پڑے گا یہ وقت ذاتی ترقی اور مرتبے حاصل کرنے کا نہیں۔ یہ وقت ہے تعمیری کوشش کا، بے لوث جد و جہد کا، مستقل مزاجی سے فرض شناسی کا"۔

اسی موقع پر آپ نے فرمایا :

”خدا نے ہمیں یہ سنہری موقع عطا کیا ہے کہ ہم ثابت کر دکھائیں کہ ہم واقعی ایک نئی مملکت کے معمار ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ خدا نخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمارے متعلق یہ کہیں کہ ہم یہ عظیم بار اٹھانے کے قابل ہی نہ تھے“۔

۲۱ فروری ۱۹۴۸ء کو قائداعظم نے بری فوج کے جوانوں سے یوں خطاب کیا۔

” اس مشینی دور میں جبکہ انسان کی خوف خدا سے عاری ذہانت تباہی و بربادی کے نت نئے تباہ کن آلات ایجاد کرتی رہتی ہے آپ کو زمانے کے مطابق چلنا پڑے گا۔ اور اپنے علم، ساز و سامان اور اسلحے کو جدید ترین معیار کے مطابق رکھنا پڑے گا۔ اس لیے نہیں کہ ہم کسی کے خلاف جارحیت کا ارادہ رکھتے ہیں؛ بلکہ اس لیے کہ یہ ہماری سلامتی کا بنیادی تقاضا ہے مضبوط ہونا ہی دوسروں کی جارحیت سے محفوظ رہنے کی ضمانت ہے“

۱۲ اپریل ۱۹۴۸ء کو آپ نے فرمایا :۔

” کبھی نہ بھولیے کہ اتحاد میں برکت ہے اپنی رجمنٹ پر فخر کیجئے اپنے ڈویژن اور اپنی کور پر فخر کیجئے۔ لیکن پاکستان پر فخر ہے نہ صرف فخر بلکہ خود کو اس کے لیے وقف کر دیجئے۔ اس لیے کہ پاکستان کو آپ پر اعتبار ہے پاکستان آپ پر انحصار کرتا ہے۔ پاکستان آپ کو اپنا محافظ سمجھتا ہے۔ اس اعتماد کی لاج رکھیے اور خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کیجئے“۔

۱۵ اپریل ۱۹۴۸ء کو پنجاب رجمنٹ سے پشاور میں خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا” ہمیشہ ان تصورات اور عزائم کے مطابق زندگی بسر کیجئے جن کے لیے آپ

حال ہی میں اپنی زندگیاں وقف کا عہد کر چکے ہیں۔ میری مراد پاکستان کی خدمت سے ہے۔ کمزوروں کی حمایت اور شہیدوں کی مقدس یاد کے سلسلے میں اپنا فرض ادا کر کے اسلام کی شان و شوکت میں چار چاند لگا دیئے۔"

اسی تقریب میں آپ نے یہ بھی فرمایا۔

"الفاظ کی اتنی اہمیت نہیں جتنی قدر و قیمت افعال کی ہوتی ہے مجھے یقین ہے کہ جب پاکستان کے دفاع اور قوم کی سلامتی اور حفاظت کے لیے آپ کو بلایا جائے گا تو آپ اسلاف کی روایت کے مطابق شاندار کارناموں کا مظاہرہ کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان کے ہلالی پرچم کو سربلند کیے رکھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی عظیم قوم کی عزت اور وقار کو ہر حال میں ہر قیمت پر برقرار رکھیں گے۔"

۱۳ اپریل ۱۹۴۸ء کو رسالپور میں فضائی فوج سے خطاب کرتے ہوئے قائدِاعظم نے فرمایا:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ملک مضبوط فضائیہ نہیں رکھتا وہ اپنے دشمن کے رحم و کرم پر ہے پاکستان کو چاہیے کہ جلد سے جلد اپنی فضائی طاقت کو مضبوط سے مضبوط تر بناتے۔ ایک ایسی مستعد اور ہوشیار فضائیہ جس کا ثانی دُنیا میں کوئی اور نہ ہو ایسی فضائیہ جو پاکستان کے دفاع میں بری اور بحری طاقت کی دست و بازو ثابت ہو۔"

اس موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا:۔

"ہوائی جہازوں اور ان کے عملے کی تعداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا اصل چیز فضائیہ

یں جذبہ پرشوق اور سخت نظم و ضبط ہے۔ یں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف نظم و ضبط اور خود اعتمادی ہی سے پاکستان کی فضائیہ پاکستان کے شایان شان بن سکتی ہے۔"

آخر میں قائداعظم کا وہ پیغام جو پاکستانی افواج کے ہر سپاہی ہر افسر کے نام آرڈر آف دی ڈے کی حیثیت رکھتا ہے۔

"خدا کی قسم ہم کبھی ہار نہ مانیں گے یں پاکستان کی حفاظت کے لیے تنہا لڑوں گا اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں یں سکت اور میرے جسم یں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے۔

مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی ایسا وقت آجاتے کہ پاکستان کی حفاظت کے لیے جنگ لڑنا پڑے تو کسی صورت یں ہتھیار نہ ڈالیں اور پہاڑوں یں جنگلوں یں میدانوں اور دریاؤں یں جنگ جاری رکھیں۔"

قائداعظم زندہ باد!

قائداعظم اور تعلیم

قائداعظم کی قیادت ہمہ گیر تھی۔ قومی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو انکی رہنمائی کی روشنی سے روشن نہ ہو۔ تعلیم کے موضوع پر ان کے بیانات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

تعلیم زندگی اور موت کا مسئلہ

"ہماری قوم کے لیے تعلیم زندگی اور موت کا مسئلہ ہے دنیا اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ نہ بنایا تو نہ صرف یہ کہ آپ پیچھے رہ جائیں گے بلکہ خدانخواستہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔
تعلیم کی اشاعت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اس مقصد کی خاطر جتنی بھی مصیبتیں جھیلی جائیں کم ہیں۔"

(کراچی ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء)

تلوار سے بھی زیادہ طاقت ور

۳۔ جولائی ۱۹۴۳ء کو بلوچستان مسلم لیگ کے اجلاس کے موقعہ پر طلبہ نے تلوار کو روایتی تحفے کے طور پر پیش کیا تھا۔ قائداعظم نے اس کے جواب میں یہ معنی خیز فقرے کہے:۔

"یہ تلوار جو آپ نے مجھے عنایت کی ہے صرف حفاظت کے لیے اُٹھے گی لیکن فی الحال جو سب سے ضروری امر ہے وہ تعلیم ہے۔ علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ جائیے اور علم حاصل کیجئے۔" لیکن وہ برطانوی دور کے پرانے طرز تعلیم کی خامیوں سے بھی خوب واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کراچی کو ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو یہ پیغام دیا۔

"ہمیں اپنی تعلیمی پالیسی، اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا ہے جو ہمارے لوگوں کے مزاج کے مطابق ہو جو ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہو، جو دنیا میں ہونے والی وسیع ترقیوں اور جدید تقاضوں کے مطابق ہو۔"

آپ نے زور دے کر کہا:

"پاکستان کی ترقی کا انحصار زیادہ تر طرز تعلیم پر ہے۔ یعنی ہم کیونکر اپنے بچوں کو پاکستان کا سچا خدمت گزار بناتے ہیں۔"

تعلیم کا مطلب محض کتابی تعلیم نہیں ہوتا اور ہمارے ہاں تو کتابی تعلیم بھی نچیر سے بہت کمزور اور ناقص ہے ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے لوگوں کی توانائیوں کو ایک راہ پر لگائیں اور آنے والی نسلوں کے کردار کی تعمیر ابھی سے کریں۔ اس امر کی فوری اور اشد ضرورت ہے کہ ہمارے جوانوں کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تعلیم دی جائے کیونکہ اسی سے ہماری مستقبل کی معاشی زندگی کا معیار بلند ہو گا۔

تعلیم کے ساتھ کردار کی تربیت پر قائداعظم نے ہر موقعہ پر زور دیا، اُنہوں نے فرمایا:

"بغیر کردار کے ڈگری کا حصول محض تضیع اوقات ہے۔"

تعلیم کے عمل میں ذہنی نشو و نما کی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت اور مضبوطی کی جو اہمیت ہے اس کے بارے میں قائداعظم نے فرمایا:۔

"آپ کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ جسمانی قوت پیدا کیجئے لڑائی جھگڑے زبردستی کے لیے نہیں۔ بلکہ سپاہیانہ قوت پیدا کرنے کے لیے تاکہ آپ عمر بھر قومی زندگی کے ہر شعبے میں طاقت توانائی کا سرچشمہ بنے رہیں"۔

(کل پاکستان اولمپک کھیل ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۸ء)

نظریہ پاکستان منزل بہ منزل

"مارچ ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا تھا پاکستان اسی روز وجود میں آگیا تھا جس روز ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا۔ قائداعظم کے اس قول میں دو قومی نظریہ کی بنیادی توجیہہ ہے۔ چونکہ اس مذاکرے کا موضوع نظریہ پاکستان کی تاریخ ہے اس لیے میں اس تصوّر کی چند کڑیاں جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔

برصغیر ہند و پاک میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ ۱۲ء عیسوی میں محمد بن قاسم کے جہاد سے شروع ہوتی ہے۔ مسلمان فاتح یہاں رہے بسے بھی، اسے انہوں نے وطن بھی بنایا۔ ۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی تک تقریباً ہزار سال انہوں نے یہاں حکومت بھی کی۔ لیکن مہاجر مسلمان اور مقامی مسلمان جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ سماجی اور معاشرتی اعتبار سے ہمیشہ ہندوؤں سے علیحدہ ہی رہے۔ وہ ہندو قومیت اور تہذیب میں کبھی جذب نہیں ہوئے۔ دو قومیتوں کے دھارے مذہبی اور تہذیبی سطح پر تیل اور پانی کی روؤں کی طرح ساتھ ساتھ تو چلتے رہے لیکن ملے کبھی نہیں۔ جب تک مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی طاقت مضبوط رہی یہ معاشرتی اور تہذیبی علیحدگی کوئی

مسئلہ بن کر سامنے نہیں آتی۔ لیکن ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا شیرازہ بکھرتے ہی ہندوؤں نے مرہٹوں کی قیادت میں قومی بنیاد پر مسلمانوں کی حکومت کے خلاف پرانی، سیاسی دشمنی کو ایک منصوبے کے تحت منظم کرنا شروع کیا۔ ہندو قومیت کی اس جارحانہ تحریک کا نشانہ براہ راست مسلمان عوام بن رہے تھے۔

ہندو مسلم قومیتوں کے ٹکراؤ کے اثرات کو سب سے پہلے غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی نے محسوس کیا۔ وہ پہلے مفکر تھے جنہوں نے برصغیر میں مسلم قومیت کی نظریاتی بنیادوں پر تنظیم کی ضرورت محسوس کی اور مسلمانوں کو اصل اسلام کی طرف لوٹنے کی دعوت دی اور اسلام کے معاشرتی اور معاشی اصولوں کی زمانے کے حالات کے مطابق وضاحت کی اور اسلام کو ایک متحرک قوت اور دین کے طور پیش کیا۔ انہوں نے یہ عملی سیاسی قدم بھی اٹھایا کہ ذاتی خطوط لکھ کر احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کی تخت و تاراج اور مسلمانوں کی حالت زار سے آگاہ کیا اور اسلام کے نام پر مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ ۱۷۶۱ء اور بعد کے معرکوں میں ابدالی نے مرہٹوں کو عبرت ناک شکستیں بھی دیں۔ مرہٹے اور ہندو میدان جنگ میں تو ہار گئے۔ لیکن ہندو اور مسلمان قومیتوں کی جو جنگ کھل کر شروع ہو چکی تھی وہ ختم نہیں ہوئی بلکہ وہ جنگ کی آگ کی طرح پھیلتی ہی چلی گئی۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں شاہ ولی اللہ کی فکری تحریک ہندوستان میں مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کا پہلا اہم اشارہ تھی۔ پھر ۱۹ صدی کے شروع

میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد اور بنگال میں تیتو میر اور حاجی شریعت اللہؒ کی تحریکیں مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کی لہریں تھیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے میرِ کارواں سر سید احمد تھے۔ وہ مسلمانوں کے قومی مفاد کے لیے تگ و دو کر رہے تھے لیکن ہندو مسلم اتحاد کے خلاف بھی نہیں تھے۔ لیکن بہت جلد انہیں اندازہ ہو گیا کہ ہندو مسلم ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ حالی نے حیات جاوید میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب ۱۸۶۷ء میں بنارس کے ہندوؤں نے اُردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کیا، اور سخت متعصبانہ رویہ اختیار کیا تو سر سید نے بنارس کے کمشنر مسٹر شکسپیئر سے صاف کہہ دیا کہ ہندو مسلمان متحد نہیں رہ سکتے۔ سر سید کے الفاظ ہیں۔

"اَب مجھے معلُوم ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔"

قابلِ غور نقطہ یہ ہے کہ سر سیّد نے دو قوموں کا لفظ استعمال کیا ہے اور ہندو مسلمانوں میں مزید اختلاف کی پیش گوئی کی ہے جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ سر سید نے ہندو ذہن کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔ اس حقیقت کا احساس کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کو ۱۸۸۰ء میں قائم کی گئی کانگرس میں شرکت سے باز رکھا تھا۔

سر سید احمد خان نے اپنی زندگی کے آخری دور میں مغربی طرز کی جمہوریت کو مسلمانوں کے لیے مہلک قرار دیا اور ہندوستان کو برصغیر قرار دیتے ہوئے مختلف

قوموں کا وطن شمار کیا۔ بلکہ سرسید کی ایک تقریر تو ایسی بھی ہے کہ جس میں پاکستان کی نظریاتی ہیئت تشکیل پاتی نظر آتی ہے (بحوالہ کتاب آخری مضامین صہ ۴۹ پاکستان کی نظریاتی بنیادیں صہ ۱۰۴) ۱۸۹۴ء میں جالندھر میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے کہا ہماری تعلیم پوری اُس وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونیورسٹی کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے۔

فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ اور لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔ آخری جملے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ سرسید مسلمانوں کے لیے ایک ایسی مملکت کا خواب دیکھ رہے تھے جس کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ نظریۂ پاکستان کے پہلے معمار سرسید تھے۔ ان ہی کے مبارک ہاتھوں ہندوستان میں مسلمانوں کی نئی ذہنی اور سیاسی زندگی کا آغاز ہوا انہی نے ہی علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی جو پاکستان کی اساس تھی۔

۱۸۸۲ء میں ہندوستان میں البرٹ بل نافذ ہوا۔ اس کے بعد سے ہندو مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ رہنے لگے اور ایک دوسرے کی رسوم اور تہواروں پر جھگڑے ہونے لگے۔ اس صورت حال پر عبدالحلیم شرر نے رسالہ تہذیب ۲۳ اگست ۱۸۹۰ء کے شمارے میں لکھا "ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آگیا ہے کہ کسی فرقے کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین و دل شکنی کے پوری نہیں ہوسکتیں اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کی طرف توجہ نہ دے تو بہتر ہے کہ ہندوستان کے اضلاع ہندو مسلمان باہم تقسیم کرلیں اور اپنی آبادی علیحدہ کرلیں"

مولانا عبدالحلیم شرر کا یہ آخری جملہ کہ ہندوستان کے اضلاع ہندو مسلمان آپس میں تقسیم کریں۔ پاکستان کی منزل کی طرف واضح نشان دہی کرتا ہے۔

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے بعد ہندوؤں نے جو مخالفانہ رویہ اختیار کیا اس سے مسلمان لیڈروں کو پہلی بار احساس ہُوا کہ ان کا بھی علیحدہ سیاسی پلیٹ فارم ہونا چاہیے پھر منٹو مارلے اصلاحات بھی آنے والی تھیں چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں آغا خان کی سربراہی میں مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے سے ملا اور جداگانہ حق انتخاب کا مطالبہ پیش کیا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ کے گھر مسلم لیگ قائم ہوئی۔ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کا حق مان لیا اور دوسرے تحفظات بھی دیے۔ یہ پاکستان کی طرف پہلا آئینی قدم تھا۔ لیکن آزادی کا خیال ابھی کوسوں دُور تھا۔ ۱۹۱۴ء کے اوائل میں لندن کے اخبار ڈیلی ایکسپریس میں ایک نقشہ شائع ہوا جس میں قسطنطنیہ سے سہارنپُور تک شمالی ہند کا علاقہ ایک تیر سے ملایا ہوا تھا جس کو مسلم کاریڈور کا نام دیا گیا۔ اس کا مصنف ٹائمز آف انڈیا کا سابق ایڈیٹر لورل فریزر تھا۔ یہ بھی مسلمانوں کے ہندوستان سے علیحدہ امکانی وطن کی طرف اشارہ تھا۔ ۱۹۱۵ء میں بزم شبلی سے خطاب کرتے ہوئے چوہدری رحمت علی نے کہا تھا کہ ہندوستان کا شمال مغربی حصہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ اِسے مسلم ریاست میں بدلا جائے۔ ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ ہوا یہ مسٹر جناح کی کوششوں سے ہندو اور مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کی پہلی اور آخری ٹھوس کوشش تھی۔ اس میں جداگانہ انتخاب کا اصول کانگریس نے بھی مان لیا تھا۔ لیکن بعض سیاسی مفکر اس وقت بھی اسی خیال پر مصر تھے کہ ہندوستان

کو ہندو مسلم ریاستوں میں تقسیم کرنا ہی ہند کے سیاسی مسئلہ کا بہترین حل ہے۔

۱۹۱۷ء میں سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس اسٹاک ہوم کے موقعہ پر علی گڑھ کے خیری برادران نے تقسیم ہند کا خیال پیش کیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں بدایوں، یو پی کے اخبار ذوالقرنین میں محمد عبدالقادر بلگرامی نے گاندھی کے نام ایک کھلا خط شائع کرایا۔ جس میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں اضلاع کی فہرست بھی دی گئی۔ ۱۹۲۱ء میں حسرت موہانی کے بیانات سے ۱۹۲۲ء میں نادر علی ناگپوری کے کتابچے سے تقسیم ہند کی تائید ہوتی ہے۔

۱۹۲۳ء میں ڈیرہ اسماعیل خان کے سردار محمد گل خان نے فرنٹیئر انکوائری کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوتے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی کہ پشاور سے آگرے تک علاقہ مسلمانوں کو دیا جائے۔

۱۴۔ دسمبر ۱۹۲۴ء کے اخبار ٹریبون میں خود کانگریسی رہنما لاجپت رائے نے تقسیم ہند کے حق میں لکھا۔

۲۲۔ مئی ۱۹۲۵ء کے کامریڈ میں مولانا محمد علی نے صوبہ سرحد میں اصلاحات کی حمایت کرتے ہوتے لودل فریزر نے مسلم کاریڈور کا حوالہ بھی دیا۔ جس میں ہندوؤں نے بڑی لے دے کی۔ ۱۹۲۶ء میں مولانا عبیداللہ سندھی نے تقسیم ہند کے خیال کا اعادہ کیا۔

اکتوبر ۱۹۲۸ء میں آغا خان نے لندن کے اخبار ٹائمز میں لکھا۔ پھر دسمبر ۱۹۱۸ء میں آل پارٹیز کنونشن کلکتہ میں ہر صوبے کے لیے آزادی کی تجویز پیش کی بکم جنوری ۱۹۲۹ء کو آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں آغا خان نے پھر اسی تجویز کو دہرایا۔

لیکن اب تک یعنی دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس ۱۹۲۹ء تک تقسیم ہند کے جو خیالات سامنے آتے وہ بیشتر غیر سیاسی مفکروں کے ذاتی تاثرات کی حیثیت

رکھتے تھے۔ ان کی بہت زیادہ سیاسی اہمیت نہیں تھی۔ مارچ ۱۹۲۸ء میں ہندوستان کا آئندہ آئینی ڈھانچہ تیار کرنے کے لیے سائمن کمیشن آیا۔ جس کے مقابلے میں نہرو رپورٹ تیار ہوئی۔ جناح اس وقت تک بھی کانگرس سے مفاہمت کرنے کو تیار تھے۔ نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کو سخت مایوس کیا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء کے آغاز اور ۱۹۲۹ء کے وسط میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں پھر مسلمانوں کے لیے آئینی تحفظات کی پختہ بنیاد تلاش کرنے کی کوشش شروع ہوئی اپریل ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس نے انڈین کنفیڈریشن کے اندر رہتے ہوئے۔ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا

۲۹، دسمبر ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں علامہ اقبال کی صدارت میں مسلم لیگ کا جو جلسہ ہوا اس کے خطبہ میں اقبال نے پہلے تو وہی کہا جو مسلم لیگ کا سرکاری مؤقف تھا۔ ان کے یہ الفاظ تھے۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے وفاق کے اندر ان کو حکومت خود اختیاری دے دی جائے بالکل جائز ہے۔"

اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے صرف لیگ کے نقطۂ نظر کو مدلل انداز میں بیان کرنے پر بس نہیں کیا بلکہ اپنی ذاتی رائے کو بھی بیان کیا۔ جو اصل میں پاکستان کی طرف پہلا واضح قدم تھا۔ اس لیے اقبال کو تصورِ پاکستان کا خالق کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ خیال بالکل نیا نہیں تھا۔

اقبال کے اپنے الفاظ یہ تھے۔

"میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک واحد آزاد مسلم ریاست تشکیل کی جائے خواہ سلطنت برطانیہ سے

اس کا تعلق ہو یا نہ ہو۔ ایسی شمال مغربی ریاست کی تخلیق ہندوستانی مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے لیے مقدر ہو چکی ہے"۔

۱۹۳۰ء میں ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک مکمل آزاد مسلم ریاست کے قیام کی تجویز اقبال کی ذاتی تجویز تھی۔ اس کو مسلم لیگ کی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ ۳۲۔۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس میں مسلمانوں میں یک جہتی نہیں تھی۔ عام رجحان فیڈریشن یا کنفیڈریشن کی طرف تھا۔ خود اقبال نے تیسری گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۲ء میں کہا تھا "علیحدہ مرکز کی ضرورت نہیں صوبے خود مختار اور آزاد ہوں"۔

اقبال نے جس آزاد شمال مغربی مسلم ریاست کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کا کوئی نام تجویز نہیں کیا گیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ ایک خیال تھا۔ مطالبہ نہ تھا۔ جب بعض انگریزوں اور ہندوؤں نے ان کی تجویز کو تقسیم کے معنی پہنائے تو ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے ٹائمز لندن میں اقبال نے وضاحت کی کہ یہ محض تجویز تھی مطالبہ نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے یہاں تک لکھا "یعنی کوئی معقول مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا۔

کہ برٹش کامن ویلتھ سے باہر شمال مغرب ہند میں کوئی آزاد ریاست یا ریاستیں قائم کرنا ممکن عملی سیاست ہے"۔

لیکن ۱۵۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو نیشنل لیگ لندن کے جلسے میں اقبال نے پھر زیادہ مدلل انداز میں علیحدہ ریاست کے قیام کو بہترین امکانی حل بتایا۔ گول میز کانفرنس میں ہندوؤں کے متعصبانہ رویے سے مایوس ہو کر دسمبر ۱۹۳۲ء تک اقبال اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے "اب الگ مطالبہ ملک کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا"۔

جنوری ۱۹۳۳ء میں کیمبرج کے چوہدری رحمت علی اور ان کے تین ساتھیوں نے ایک کتابچہ شائع کیا۔" اب یا کبھی نہیں"۔ جس میں متحدہ ہندوستانی قومیت کو واضح طور پر مسترد کیا گیا تھا۔ گول میز کانفرنس میں زیرِ غور وفاقی آئین کی شدید مخالفت کی گئی تھی اور کشمیر۔ پنجاب۔ سرحد۔ سندھ۔ بلوچستان پر مشتمل ایک آزاد مسلم مملکت کی تشکیل پر زور دیا گیا تھا۔ اس کتابچے میں لفظ پاکستان بھی وضع کیا گیا تھا۔ بقول رحمت علی لفظ پاکستان فارسی لفظ بھی ہے اور اُردو بھی۔ اس میں پے پنجاب۔ الف۔ افغانیہ (سرحد) ہے۔ کاف کشمیر سے۔ س سے سندھ اور تان بلوچستان سے لیا گیا۔ پاکستان کے لفظی معنی ہیں" پاک لوگوں کا وطن"

گول میز کانفرنس کے دوران چوہدری رحمت علی نے انگلستان میں اقبال سے ملاقات بھی کی تھی۔ اس سے بہت پہلے ایک گمنام طالب علم کی حیثیت سے چوہدری رحمت علی نے 1915ء میں اسلامیہ کالج لاہور کی بزم شبلی کی افتتاحی تقریب کے موقعہ پر بھی آزاد مسلم ریاست کے قیام کا تذکرہ کیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں انہوں نے پاکستان کے نظریے کو وضاحت سے بیان کیا اور لفظ پاکستان بھی وضع کیا۔

۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ آیا۔ جس میں صوبوں کی محدود خود مختاری اور مرکزی وفاق کا اہتمام تھا۔ جو یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے جزوی طور پر نافذ بھی ہُوا۔ اس کے تحت صوبائی حکومتوں کے انتخابات ہوئے۔ کانگریس اور لیگ دونوں نے الیکشن لڑے۔ جناح ۱۹۳۷ء میں ایک بار پھر اور آخری بار مصالحت کے لیے تیار ہُوئے۔ لیکن ہندوؤں نے مفاہمت کرنے سے انکار کر

دیا کانگریس نے سات صوبوں میں وزارت بنائی اور جولائی ۱۹۳۷ء سے اکتوبر ۱۹۳۹ء تک حکومت کی۔ اس عرصے میں مسلم اقلیتوں پر وہ ظلم ڈھائے گئے کہ دنیا چیخ اٹھی۔ ہندو کانگریس کے عملی رویے سے ہندوستان بھر کے مسلمان اور ان کے لیڈر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی سیاسی مفاہمت ممکن نہیں. چنانچہ مسلمانوں نے اپنے قومی مفادات کے تحفظ کے لیے واضح راہِ عمل کی تلاش شروع کر دی۔ ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد کے سید لطیف نے چار منطقوں پر مشتمل وفاق کی تجویز پیش کی۔ ڈاکٹر لطیف کی کتاب کے دیباچے میں سر عبداللہ ہارون نے دو وفاقوں کی تجویز پیش کی۔ ۱۹۳۹ء میں پنجابی کے نام سے پانچ ملکوں کی کنفیڈریسی کی تجویز پیش کی گئی۔ متحدہ ہندوستان کے تحت جولائی ۱۹۳۹ء میں سر سکندر حیات نے اپنی تجویز پیش کی۔ یہ سات حصوں کے وفاق کی سکیم تھی.

۱۹۳۹ء میں علی گڑھ کے دو پروفیسروں نے تین آزاد ریاستوں کی تجویز پیش کی۔ پاکستان، بنگال اور ہندوستان جو معاہدوں سے آپس میں اور برطانیہ سے منسلک ہوں۔ ہندوستان کی سیاسی فضا میں کسی نہ کسی شکل میں علیٰحدگی کے یہ خیالات اُڑ رہے تھے کہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کراچی صوبائی مسلم لیگ نے اپنے جلسے میں ایک قرارداد کے ذریعے قراردادِ پاکستان کی بنیاد ڈالی۔ اس قرارداد میں مکمل آزاد حقِ خود ارادی کا عزم کیا گیا تھا اور پہلی بار قوم کا لفظ استعمال ہُوا تھا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے آئینی تجویزوں کی چھان بین کے لیے کمیٹی مقرر کر دی۔ ۲۲، مارچ ۱۹۴۰ء تک قرارداد

کے مسودے پر غور ہوتا رہا۔ ۲۳ مارچ کو یہ قرارداد اقبال پارک کے ایک جلسے میں بنگال کے وزیرِ اعظم اے۔ کے فضل الحق نے پیش کی۔

چودھری خلیق الزّمان کی تائید کے بعد دوسرے صوبوں کے مندوبین نے تقریریں کیں۔ اِس موقع پر بہترین تقریر قائدِ اعظم کی تھی جس میں قراردادِ پاکستان کے پس منظر اور دو قومی نظریہ پر بڑی مدلّل بحث تھی۔ اِس قرارداد کو قراردادِ لاہور کا نام دیا گیا۔ اِس میں ہند کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو آزاد مملکتوں کے قیام کی تجویز رکھی گئی تھی۔ اپریل ۱۹۴۱ء میں مدراس میں اِس قرارداد کو مسلم لیگ کا باقاعدہ نصب العین بنا دیا گیا۔ ابھی تک اِس میں ریاستوں کا لفظ موجود تھا۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں ہندوستان بھر کے لیگی ممبروں کا کنونشن ہوا۔ جس میں حسین شہید سُہروردی کی قرارداد پر ریاستوں کے بجائے ریاست کا لفظ کر دیا گیا۔ گویا ایک متحدہ پاکستان کا عہد نامہ بن گیا۔ اِس قراردادِ پاکستان کے مطابق ۳۔ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیمِ ہند کا اعلان کر دیا گیا اور پاکستان ایک آزاد خود مختار اِسلامی مملکت کی حیثیّت سے ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو وجُود میں آ گیا۔ ہمیشہ قائم رہنے کے لِیے۔

اِن کتابوں کے بغیر کوئی لائبریری مکمّل نہیں

کتاب	مصنف	قیمت
حیاتِ رسالت مآبؐ	راجہ محمدؐ شریف	۷۵٫۰۰ روپے
جمالِ نبیؐ	〃 〃 〃	۱۵٫۰۰ 〃
کمالِ رسُولؐ	〃 〃 〃	۱۵٫۰۰ 〃
جمالِ رسُولؐ	〃 〃 〃	۱۵٫۰۰ 〃
غیب کی باتیں	〃 〃 〃	۱۵٫۰۰ 〃
سی سالہ خلافتِ راشدہ	معراج الدّین	۱۸۰٫۰۰ 〃
مکتوباتِ نبویؐ	سیّد محبوب رضوی	۶۰٫۰۰ 〃
مکاشفۃ القلوب	اِمام غزالی	۱۲۰٫۰۰ 〃
اسمائے نبویؐ	آلِ احمد سرور	۲۵٫۰۰ 〃
اسماء الحُسنیٰ	احسن شکوہ	۲۰٫۰۰ 〃
خُلفائے راشدین کوئز	پروفیسر غلام قادر	۴۰٫۰۰ 〃
معلوماتِ قرآنِ پاک کوئز	رانا طاہر رشید	۱۵٫۰۰ 〃
معجزاتِ قرآن	محمد سرفراز ناز	۲۰٫۰۰ 〃
اِمام احمد بن حنبل	محمد ابو زہرہ	۹۹٫۰۰ 〃
اِمام ابنِ تیمیہ	محمد یوسف کوکن	۱۵۰٫۰۰ 〃
بہارِ نعت	حاجی محمد منیر قریشی	۱۵٫۰۰ 〃
نعتِ مُصطفےٰؐ	طاہر حلیم	۹٫۰۰ 〃
احوال العارفین	حافظ غلام فرید	۱۰۰٫۰۰ 〃
مظاہر الحق	شرح مشکوٰۃ شریف	۶۰۰٫۰۰ 〃
رُوحِ اسلام	سیّد ابُو الحسن برنی	۲۰۰٫۰۰ 〃
الحسنؓ والحسینؓ	محمد رضا مصری	۴۵٫۰۰ 〃
اِسلامی اخلاق	مولانا حبیب الرحمٰن	۱۵٫۰۰ 〃

ہر معیاری بُک شاپ سے خرید فرمائیں

اِن کتابوں کے بغیر کوئی لائبریری مکمّل نہیں

کتاب	مصنف	قیمت	
اِنتقام	ڈاکٹر ذکار الرّب رباب	۱۰۰٫۰۰	روپے
قرۃُ العین حیدر کے منتخب افسانے	قرۃ العین حیدر	۱۰۰٫۰۰	〃
خلیل جبران کے بہترین افسانے	خلیل جبران	۶۰٫۰۰	〃
صبح کی دستک	〃	۳۰٫۰۰	〃
راجندر سنگھ بیدی کے پسندیدہ افسانے	راجندر سنگھ بیدی	۱۰۰٫۰۰	〃
لمس	〃	۳۰٫۰۰	〃
تُو چاند مَیں سمندر	امرتا پریتم	۶۰٫۰۰	〃
گنج ہائے گراں مایہ	رشید احمد صدیقی	۱۰۰٫۰۰	〃
پھُول اور پتّھر	میمُونہ انصاری	۱۰۰٫۰۰	〃
زیرِ سطح	قیوم راہی	۴۰٫۰۰	〃
وردی کے اندر آدمی	انعام الرحمٰن سحری	۵۰٫۰۰	〃
رانگ نمبر	انجم ممتاز	۳۵٫۰۰	〃
نادیہ	ڈاکٹر شاہین جی	۳۵٫۰۰	〃
غالب فِکر و فن	رشید حسن خان	۳۰٫۰۰	〃
غزلیاتِ فارسی	مرزا اسد اللہ غالب	۳۰۰٫۰۰	〃
تنقیدِ غالب کے سو سال	سیّد فیاض محمود	۲۲۵٫۰۰	〃
جدید اُردو ادب	ڈاکٹر محمد حسن	۲۵٫۰۰	〃
معاصر ادب کے پیش رَو	〃	۳۰٫۰۰	〃
لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر ابُو اللّیث صدّیقی	۱۵۰٫۰۰	〃
ڈاکٹر جمیل جالبی	نسیم فاطمہ	۱۲۰٫۰۰	〃
تاریخ ادب اُردو	رام بابو سکسینہ	۱۰۰٫۰۰	〃
تنقید و تناظر	پروفیسر ڈاکٹر نعیم نقوی	۵۰٫۰۰	〃

ہر معیاری بُک شاپ سے خرید فرمائیں

سکُولوں کالجوں کی لائبریریوں کے لئے منتخب کُتب

کتاب	مصنف	قیمت
قریۂ جاں	سیّد ضمیر جعفری	۳۰۰,۰۰ رُوپے
ضمیرِ ظرافت	״ ״ ״	۵۵,۰۰ ״
ضمیریات	״ ״ ״	۵۰,۰۰ ״
اُڑتے خاکے	״ ״ ״	۱۰۰,۰۰ ״
بنتِ مشرق	ماجد صدّیقی	۱۰۰,۰۰ ״
آنگن آنگن رات	״ ״	۱۲۰,۰۰ ״
غزل سرا	״ ״	۳۰۰,۰۰ ״
امانت	شاہین مُفتی	۲۰,۰۰ ״
سُرمئی سائے	پروفیسر منظر مُفتی	۳۰,۰۰ ״
خندۂ گُل	شیخ غلام علی بلبل	۴۵,۰۰ ״
خُدا جھُوٹ نہ بُلوائے	دلاور فگار	۷۵,۰۰ ״
چاند نگر	سیّد مسعُود احمد شاہ	۴۰,۰۰ ״
تہی دامن	ڈاکٹر سعید اقبال سعدی	۵۰,۰۰ ״
غدر	محمد اظہار الحق	۳۵,۰۰ ״
اِکو الف تیرے درکار	منظور احمد	۶۰,۰۰ ״
سانجھیاں پیڑاں	سعید جعفری	۳۰,۰۰ ״

ہر معیاری بُک شاپ سے خرید فرمائیں

اِن کتابوں کے بغیر کوئی لائبریری مکمّل نہیں کہی جاسکتی

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
جُراَتوں کے نشان	سعید ارشد	۲۵۰,۰۰ رُوپے	اُڑتے خاکے	سیّد ضمیر جعفری	۱۰۰,۰۰ رُوپے
تذکرۂ شُہدا	〃	۱۵۰,۰۰ 〃	ضمیریات	〃	۵۰,۰۰ 〃
اکرم نشانِ حیدر	〃	۱۰۰,۰۰ 〃	قریۂ جاں	〃	۳۰,۰۰ 〃
حق نواز کیانی	〃	۱۰۰,۰۰ 〃	بہروپ نگر	عصمت چُغتائی	۶۰,۰۰ 〃
کردار ساز	〃	۲۰۰,۰۰ 〃	عصمت کے شاہکار افسانے	〃	۱۰۰,۰۰ 〃
مکالماتِ اقبال	〃	۲۰۰,۰۰ 〃	آیا بسنت سکھی	واجدہ تبسّم	۳۰,۰۰ 〃
سر سیّد احمد خان	راجہ طارق محمود	۲۰۰,۰۰ 〃	واجدہ کے بہترین افسانے	〃	۱۰۰,۰۰ 〃
چنگیز خان	〃	۱۰۰,۰۰ 〃	زرگاؤں کی رانی	کرشن چندر	۳۰,۰۰ 〃
اورنگ زیب عالمگیر	〃	۲۰۰,۰۰ 〃	کرشن چندر کے یادگار افسانے	〃	۱۰۰,۰۰ 〃
اقوالِ زرّیں	شاہد حمید	۳۰,۰۰ 〃	تو چاند میں سمندر	امرتا پریتم	۶۰,۰۰ 〃
روشنی کے مینار	〃	۳۰,۰۰ 〃	امرتا پریتم کے منتخب افسانے	〃	۱۰۰,۰۰ 〃
گفتگو تقریر ایک فن	ڈیل کارنیگی	۳۰,۰۰ 〃	خزاں کا پھول	ایم۔اے سوز	۷۵,۰۰ 〃
سُلطان ٹیپو	فیض عالم صدیقی	۵۰,۰۰ 〃	رانگ نمبر	انجم ممتاز	۳۵,۰۰ 〃
اِسلام کے نامور سپہ سالار	〃	۳۰,۰۰ 〃	تجھ بن جیا کیا کیا	〃	۶۰,۰۰ 〃
خلافتِ راشدہ	〃	۶۰,۰۰ 〃	رام محمّد ڈیسوزا	علی رضا	۳۰,۰۰ 〃
خالد سیف اللہ	〃	۶۰,۰۰ 〃	لفظ کھُردرے	تنویر سپرا	۶۰,۰۰ 〃
صُبح کی دستک	خلیل جبران	۳۰,۰۰ 〃	تلخیاں	ساحر لُدھیانوی	۶۰,۰۰ 〃
غالب فکر و فن	رشید حسن خان	۳۰,۰۰ 〃	شبستان	شکیل بدایُونی	۳۰,۰۰ 〃
غالب ایک مطالعہ	〃	۶۰,۰۰ 〃	آخری شب	کیفی اعظمی	۳۰,۰۰ 〃

عظمت کے مینار — گُلشن شاہد — ۳۰,۰۰ رُوپے

ہر معیاری بُک شاپ سے خرید فرمائیں